آس پاس

(افسانوں کا مجموعہ)

○

صبا تو ایک گلستاں پہ ناز کرتی ہے
کئی فسانے مری چشمِ تر میں رہتے ہیں

◎

فاطمہ تاج

آس پاس

(افسانوں کا مجموعہ)

صبا تو ایک گلستاں پہ ناز کرتی ہے
کئی فسانے مری چشمِ تر میں رہتے ہیں

فاطمہ تاج

تاریخ وسن اشاعت :	۵/ جنوری ۱۹۹۳ء
تعدادِ اشاعت :	۵۰۰
قیمت :	۲۵/- روپے
طباعت :	اعجاز پریس۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد
طباعتِ سرورق :	انتخاب پریس، جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد
ناشر :	صالحہ الطاف
	7/824 - 3 - 11، جدید ملے پلی۔
	حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

-: کتاب ملنے کے پتے :-

- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان، پتھر گٹی۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲
- مصنف - ۲۳۹ - ۳ - ۲۲ ، مگر باؤلی۔ میر چوک۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲

○

اِنتساب

○ سلطانہ جسٹس شرف الدین احمد

○ فاطمہ عالم خاں اور

○ نایاب سلطانہ

کے نام

جن کی بے لوث محبت سے میں سرشار ہوں

○

فاطمہ تاج

○

ترتیب و تزئین

وہی خوشبو

جس مٹی کی خوشبو کو فاطمہ تاج، گذشتہ کچھ برسوں سے محسوس کر رہی ہیں اُس مٹی کو میں نے عمر کے ایک طویل عرصہ تک محسوس کیا ہے۔ فاطمہ سے میرا ایک جذباتی رشتہ ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ فاطمہ تاج افسانوں کا مجموعہ شائع کرنے والی ہیں تو میں نے خود ناشر کی حیثیت سے اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔

فاطمہ تاج حیدرآباد کی اُن باشعور اہلِ قلم خواتین میں سے ایک ہیں جن کا مستقبل روشن ہے۔ ایک ایسی شاعرہ و ادیبہ جس نے اپنے گہرے مشاہدے، عمیق مطالعہ اور حالات کی دھوپ چھاؤں سے آشنا رہتے ہوئے اپنے ادبی سفر کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ میں فاطمہ تاج کو ایک باصلاحیت شاعرہ کی حیثیت سے بھی جانتی ہوں۔

"آس پاس" فاطمہ تاج کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے، جس کا ہر افسانہ زندگی کے نشیب و فراز، راحتوں اور تلخیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔ یقین ہے کہ افسانوں کا یہ مجموعہ پسند کیا جائے گا۔ میری دعا ہے کہ فاطمہ کے ہاتھ سے کبھی قلم نہ چھوٹے اور وہ اسی طرح زبان و ادب کی خدمت کرتی رہیں۔

صالحہ الطاف

پیش لفظ

"آس پاس" فاطمہ تاج کے تیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کی غزلوں کا مجموعہ "اب کے برس" شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ کے عنوان ہی نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اہلِ ذوق شخصیتوں نے نہ صرف اس شعری مجموعہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا بلکہ اس کا "ادبی فضاء میں تازہ ہوا" کی حیثیت سے خیر مقدم کیا اور شاعرہ کو "نیا چہرہ نئی پہچان" قرار دیا۔ اس شعری مجموعہ کو دیکھ کر میرا یہ تاثر تھا کہ فاطمہ تاج کو شاعرانہ مزاج فطرت سے ودیعت ہوا ہے لیکن اب ان کے افسانوں کو دیکھنے کا موقع ملا تو یہ انکشاف ہوا کہ فاطمہ تاج ایک باصلاحیت شاعرہ ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کی نثر نگار اور بھرپور فن کار بھی ہیں۔

جہاں تک فاطمہ تاج کی شخصیت کا تعلق ہے وہ ازراہِ انکساری و شرافتِ نسوانی اپنا تعارف کروانے میں کم آمیز ہیں۔ "بریانگ دہل" کہتی ہیں کہ "جب لوگوں کے لئے سوال کرنا مشکل نہیں تو میرے لئے جواب دینا کیسے مشکل ہو سکتا ہے" لیکن جب اصل تعارف کی بات آتی ہے تو مختصر ترین تعارف سے آگے نہیں بڑھتیں، حالانکہ ان کے پاس فخر کرنے کو بہت کچھ ہے۔ ان کی شخصیت میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ فاطمہ تاج کے خسر جیب حسن بالقفیہہ سے میری دیرینہ واقفیت تھی اور ان سے نہایت گہرے اور برادرانہ مراسم تھے۔ اس تعلق سے فاطمہ تاج کو میں بہو کا درجہ بھی دیتا تو نامناسب نہ ہوتا لیکن

اُردو ادب میں ان کے مقام کے پیشِ نظر میں اِن کو " اُن دیکھی بیٹی " کہہ سکتا ہوں۔ یہاں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح مرزا غالب کلامِ دوست کو بہ نظرِ دشمن دیکھنے کے قائل تھے، میں نے فاطمہ تاج کے افسانوں کو شفقتِ پدری کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اِن کے افسانوں کے تعلق سے جو کچھ کہوں گا سچ سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

زیرِ نظر افسانے فاطمہ تاج کی شخصیت کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ فطرت اور کائنات سے اپنا ناطہ جوڑی ہوئی ہیں۔ اِن کے اطراف جو لوگ رہتے ہیں، حتیٰ کہ اِن کے شوہر اور اِن کی اولاد، کسی کو بھی اِن کی اندرونی دنیا، اِن کے جذبات اور خیالات کا پتہ نہیں۔ سب یہ جانتے ہیں کہ فاطمہ کے ہاتھ میں قلم ہے اور اِن پر کچھ دُھن سوار ہے۔ اِس سے آگے وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ فاطمہ کے اندرونی احساسات سے وہ سب ناواقف ہیں۔ اِن معنی میں فاطمہ تنہا ہیں۔ جب اِن کی شاعرانہ اور فنکارانہ کیفیت اِن کے خیالات میں طوفان بپا کرتی ہے تو وہ اشعار اور افسانوں کو اظہار کا ذریعہ بناتی ہیں اور اپنے تاثرات کو قلم بند کرتی ہیں۔ جس طرح اِن کے خیالات اور اِن کا نظریۂ حیات اِن کی شاعری سے عیاں ہے اس طرح اِن کی شخصیت اور اِن کی نفسیاتی کیفیت اِن کے افسانوں میں بکھری نظر آتی ہے۔ میں نے نہ صرف اِن کے افسانوں کو بنظرِ غائر دیکھا بلکہ بین السطور باتوں تک بھی پہنچنے کی کوشش کی۔ سیدھی سادی زبان میں لکھے گئے افسانوں کے کردار بے جان نہیں ہیں۔ اِن کو خونِ جگر کی آمیزش اور قلم کے ماہرانہ استعمال سے ایسا رنگ دیا گیا ہے کہ اِن کی سانسوں کی گرمی اور دل کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ سارے کردار جیتے جاگتے انسانی اور سماجی پہچانی شخصیتیں نظر آتے ہیں۔

زندگی میں بعض تفصیلات جن کو عام طور پر بلا ضرورت اہم سمجھا جاتا ہے، نظر انداز کر دینے کے لائق ہوتی ہیں، مثلاً نسل۔ قوم۔ مذہب یا ناموں اور خاندانوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، بلکہ اصل اہمیت جذبات، خیالات اور عمل کی ہوتی ہے۔ کچھ یہی حال افسانوں کا بھی ہے۔ فن کار کا اصل کمال یہ ہے کہ افسانوں کے کردار کے ذریعہ انسانی نفسیات، زندگی کے ولولوں، خواہشوں اور عزائم کی ہو بہو عکاسی کی جائے۔ اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی اسی وقت ممکن ہے کہ افسانہ نگار اپنے ذاتی جذبات اور اپنے ہی ماحول کو اپنے افسانوں کے کردار کے ذریعہ پیش کرے، یعنی خود اپنی ذات کو اپنی تخلیق میں سمو دے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فاطمہ تاج اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ انہوں نے اس بات کا فیصلہ کہ "زخمی پاؤں سے ٹھوکریں لگا کر پتھروں کو راستہ سے ہٹانے میں" وہ کہاں تک کامیاب ہوسکی ہیں، معزز قارئین پر رکھا ہے۔ میں ان افسانوں کے پہلے قاری کی حیثیت سے "بہ بانگِ دہل" یہ فیصلہ دیتا ہوں کہ فاطمہ تاج نے نہ صرف سنگِ راہ کو ٹھوکروں سے ہٹایا ہے بلکہ انہیں بہت دور پھینک دیا ہے۔

فاطمہ تاج کو ادبی دنیا میں روشناس کروانے میں خود ان کی شاعرانہ اور ادبی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔ کیونکہ جو بات دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے وہ ضرور اپنا اثر رکھتی ہے۔ اُمید ہے کہ ان افسانوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

۲۵ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء
عزیز باغ۔ حیدرآباد

ڈاکٹر حسن الدین احمد

ڈاکٹر اختر سلطانہ

"قید اور رہائی" اور "چشمِ نم"

(تاثرات)

سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا افسانہ "قید اور رہائی" فاطمہ تاج کی قلمی کاوش ہے۔ فاطمہ نہ صرف ایک اچھی شاعرہ ہیں، بلکہ اتنی ہی اچھی انشاء پرداز بھی ہیں۔ میدانِ افسانہ میں نووارد ہیں، لیکن کچھ بھی کہنے کے فن میں طاق اور ہاتھ میں بڑا تیز چلنے والا قلم رکھتی ہیں۔ اس لئے کوئی بھی واقعہ ان کے زیرِ قلم آجائے تو اس کے اِرد گرد فنکاری سے الفاظ کا تانا بانا بُننا ان کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ اِس افسانے کا ڈھانچہ مصنفہ نے بڑی احتیاط سے تیار کیا ہے۔ موضوع چھوٹا سا ہے، لیکن اس میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی صداقتوں اور اُن سے وابستہ مسائل کو بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مواد عام زندگی ہی سے لیا ہے آغاز ہی میں کردار اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ کہانی میں دو مرکزی کردار ہیں۔ ایک ضعیف بیوہ خاتون رما دیوی اور ان کی دوسری لڑکی ورشا جو بی۔ اے کی طالبہ ہے ورشا اپنی ماں اور دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتی ہے۔ بھائی بغرض ملازمت امریکہ میں مقیم ہے۔ ماں ورشا کی شادی کے لئے فکر مند اور متردد ہے کیونکہ وہ جہیز دینے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ لیکن اپنی بیٹی کو ایک پُرسکون و راحت مند ازدواجی زندگی دینے کی خواہاں بھی ضرور ہے۔ وہ ورشا کو اسکی پڑھائی میں مدد دینے والے لیکچرر روی سے ملنے جلنے پر خائف اور

سماج سے ڈری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ ورشا سے کہتی ہے کہ اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ روی کو راکھی باندھ دے، تاکہ ان دونوں کے آزادانہ میل جول پر لوگوں کو اعتراض کرنے کا موقع نہ ملے۔ لیکن ورشا جو روی سے محبت کرتی ہے۔ اس افسانے میں ایک جرأت منداور باعمل لڑکی کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ ماں کی پیش کردہ تجویز۔ بندھن اور رشتوں کے تعلق سے اس کے جو خیالات ہیں وہ ان اقتباسات سے ظاہر ہوتے ہیں :-

"... میں رشتوں کی پجارن نہیں ہوں۔ بھلا دیوتاؤں سے کہیں رشتے کئے جاتے ہیں۔ انھیں کسی بندھن میں نہیں باندھا جا سکتا ماں ! یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اور روی سماج کی نگاہوں میں کھٹک جائیں گے اور ـــ اور اگر ایسا ہو بھی تو مجھے پرواہ نہیں"

"... ماں رشتے دیوار ہوتے ہیں جن کو گرایا نہیں جاتا۔ رشتے فاصلوں کا دوسرا نام ہے۔ رشتے اگر نہ ہوں تو فاصلے بھی نہیں ہوتے۔ محبت کے درمیان دیواریں مت کھڑی کرو ماں۔ ورنہ دل کھنڈر ہو جائے گا۔ جہاں ویرانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ماں مجھے مجبور مت کرو کہ میں روی کو راکھی باندھوں۔ یہ دھاگہ بھی دنیا والوں کے ہونٹ سینے میں ناکام ہو جائے گا۔ ماں مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں روی سے محبت کرتی ہوں۔"

مصنف نے اس کردار کو تراشنے میں غیر معمولی دلچسپی سے کام لیا ہے، روی کے کچھ نقوش ماں اور ورشا کی زبانی عیاں ہوئے ہیں اور کچھ مصنف نے واضح کئے ہیں۔

ایک اور کردار ماسی کا بھی ہے جس کو چند ہی جملوں میں پیش کر کے اس کی شخصیت کے پس منظر میں اس کے افعال و اعمال پر اظہار رائے کرتے ہوئے مصنف

آگے بڑھتی ہیں جیسے ۔۔۔ :-

" کامنی محلے کی ماسی تھی کوئی آسان بات نہ تھی کہ اُن کے علم اور اجازت کے بغیر محلے والے کوئی قدم اٹھا سکیں۔ وہ جدھر چاہتی آگ لگاتی، جدھر چاہتی مینہ برساتی۔"

اور ایک دن ایک پارک میں وہ ان دونوں کو اکٹھے ہنستے ہوئے اور روی کو کتاب سے ایک ہلکی سی چپت ورشا کے سر پر لگاتے ہوئے دیکھ لیتی اور ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے ۔۔۔ اِس افسانے میں مکالمہ اور عمل ملے جلے ہیں۔

"۔۔۔۔ کامنی ماسی محاذِ جنگ کے جانباز سپاہی کی طرح ورشا کی ماں رما دیوی سے ملنے پہنچ گئی اور وہ ایٹمی دھماکے کئے کہ رما دیوی واقعی دہل گئیں۔"

یا یہ اقتباس :-

"۔۔۔۔ ورشا کو پہاڑوں کے نیچے آجانے کا احساس ہوا۔ وہ تو سارے زمانے کی پرواہ کئے بغیر اپنے نظریات کو روبہ عمل لانے پر تُلی ہوئی تھی مگر ماں نے ایک ہی دھماکے میں کئی پہاڑ اس کے وجود پر گرا ڈالے۔"

یہ وہ پہاڑ ہیں جو ورشا کے اندر گرے ہیں۔ ہندی زبان کے الفاظ بڑی چابکدستی سے استعمال کئے ہیں۔ واقعات کی کڑیاں مربوط اور تراش خراش موزوں و مناسب ہے۔ افسانے کے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ایک مکمل آغاز۔ ایک وسط اور آخر میں کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ کوئی ایسا موڑ کہ افسانے کی صورت بدل جائے۔

جب ورشا رات کے بارہ بجے شادی کے بندھن میں بندھ کر گھر لوٹتی ہے تو ذہنی ہلچل میں گرفتار ویسے حسین ماں اس کے ساتھ انتہائی غیر متوقعانہ نرمی کا سلوک کرتی ہے غصے کا ہلکا سا غبار بھی اس کے چہرے اور حرکات سے عیاں نہیں ہوتا۔ رہبر اور رہنما کا

کا فرض ادا کرنے اور فتح مندی سے سرشار ہونے کی واحد صورت اسے یہ نظر آتی ہے کہ وہ شئے بیاہتا جوڑے کے لئے ایسا موقعہ فراہم کردے کہ ان دونوں کو خوش آئند مستقبل مل سکے۔ ماں کے خوف اور گھبراہٹ کی تصویر کشی میں ڈرامائی کیفیت پیدا کی گئی ہے مصنفہ نے اپنے آپ کو کرداروں اور ماحول سے الگ رکھ کر اس کہانی کو پیش کیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

"چشمِ نم"

■ گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں :۔

" افسانہ چاہے علامتی ہو، استعاراتی ہو، حکایتی ہو، داستانی ہو یا سیدھا سادا بیانیہ ہو۔ افسانہ ہونا چاہیئے ۔"

فاطمہ تاج کی یہ تحریر "چشمِ نم" ایک افسانہ ہی ہے، جس کا مرکزی خیال ایک لڑکی کی اپنی ماں سے شدید محبت ہے۔ اس میں صرف دو اہم کردار ہیں۔ ایک ماں (اصغری بیگم) کا اور دوسرا ان کی لڑکی (شاہ نور۔ نوشین) کا جو بچپن میں ایک میلے میں اپنی ماں سے بچھڑ گئی تھی، جس کی پرورش ایک لاولد نیک ہستی کے گھر ہوئی ہے۔ وہ اُسے ایک معزز امیر گھرانے میں بیاہ چکے ہیں۔ نوشین کو اسکی کھوئی ہوئی ماں ایک سہیلی کی شادی کی تقریب میں نظر آتی ہے۔

افسانے کے ابتدائی حصے میں جذبات کی شدت اور اضطرابی کیفیت کو بڑی خوبصورتی سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ یہ اقتباس :۔

" ام ..... اماں ..... آں ... آں ... نوشین کی چیخ سے حویلی کے بام و در تھرا گئے۔ کمروں میں بیٹھی خواتین اور کاموں میں لگی مامائیں بھی دوڑ آئیں۔ بڑے دالان

میں نوشین ایک بوڑھی خاتون کے گود میں سر رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔ اصغری بیگم بار بار پوچھ رہی تھیں۔ یہ کون ہے؟ یہ کون ہے۔؟ وہ دیکھ نہیں سکتی تھیں۔"

آگے ماں اور بیٹی دونوں کے باطنی احساسات کی عکاسی بڑے موثر انداز میں کی گئی ہے۔ اس لڑکی نوشین کیلئے یہ ایک المیہ ہی ہے کہ ایک طویل عرصہ گذارنے کے بعد جب اُسے ماں ملتی ہے تو وہ اُسے دیکھنے سے محروم ہے۔ نوشین اپنی ماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے۔ ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ آنکھوں کی روشنی کا لوٹنا تو ممکن نہیں البتہ پیوند کاری ہوسکتی ہے۔

یہاں مصنفہ نے کہانی کو ایک موڑ دیا ہے۔ ذہنی الجھنوں سے دور۔ صرف ماں کی محبت کے جذبے سے سرشار یہ حساس لڑکی جس کے رگ و پے میں صرف ایک ہی جذبہ دوڑ رہا ہے کہ وہ کسی صورت اپنی ماں کی اس خواہش کی تکمیل کرے کہ وہ اُسے دیکھنا چاہتی ہے اور وہ یہ فیصلہ کرلیتی ہے کہ اپنی آنکھیں اپنی ماں کے نذر کردے گی، کیونکہ اُسکے خیال میں یہ اُسی کی عطا ہیں۔

اِس افسانے میں قاری مصنفہ کی موجودگی کا احساس کرتا ہے اور اختتام پر تو مصنفہ کردار پر حاوی ہوکر افسانے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ یہی نہیں وہ بے لوث محبت کے پیکر کو آخر میں موت کی نیند بھی سُلا دیتی ہیں۔

کہانی میں فضاء یاس انگیز۔ اور المیہ تاثر شدید ہے۔ اِس میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ ایک اذیت ناک صورت حال کو جنم دیتا ہے۔ بہر حال ان کی دونوں کوششیں اچھی اور قابل مبارکباد ہیں۔

دعا ہے کہ فاطمہ نئی تخلیقی راہوں پر اپنے قلم کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے اسی طرح گامزن رہیں گی۔

○

"بہ بانگِ دہل ...."

لوگوں کے لئے سوال کرنا جب مشکل نہیں تو میرے لئے جواب دینا کیسے مشکل ہو سکتا ہے ؟ لوگ مجھ سے میری علمی قابلیت جاننا چاہتے ہیں۔ میرے خاندان کا نام جاننا چاہتے ہیں۔ تعلیمی قابلیت کی محرومی کے احساس نے ہی مجھے قلمکاروں کی صف میں بٹھایا ہے۔ مڈل اسکول کی تعلیم سے کم، اور گھریلو تعلیم سے زیادہ فیض ملا۔ گھر ہی میں مجھے زبردستی بارھویں کلاس تک کا کورس پڑھایا گیا۔ کم عمری اور مخصوص حالات میں، میں سرکاری امتحان سے صاف بچ نکلی، وہ صفحات جہاں پر عربی، انگریزی کی تحریریں مجھے قابل بنانے پر مصر تھیں، میں نے ان صفحات پر بھی "مہرِ اردو" ثبت کر دی۔

ابتداء ہی سے مجھے صرف اُردو زبان پسند تھی، صرف اُردو زبان، شاعری میرے خوابوں کی منزل تھی۔ بچپن میں اپنے نصاب میں شامل علامہ اقبالؔ کے ترانوں کو ترنم سے پڑھا کرتی اور اس وقت مجھ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ میں خود کو علامہ اقبالؔ سمجھنے لگتی، نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ، بچہ شعر کہنے لگی۔ شعروں کی معصومیت سے متاثر تو کوئی کیا ہوتا، مگر کبھی کبھی اپنے استادوں کی واہ اثر کر جاتی۔ .... تیز روئے وقت کے ہمراہ میں بھی تیز گام رہی، کبھی نہیں تھکی، کہیں

نہیں رکی، میں ہمیشہ علامہ اقبالؔ کی زمین میں شعر لکھ دیتی اور اپنے آپ کو "سکندر" کی طرح مزید "فتوحات" کے لئے تیار کرتی رہتی۔ لیل و نہار کی گردش اگر نہ ہوتی تو ظاہر ہے دنیا کا سارا نظام نہ صرف بگڑ کر رہ جاتا، بلکہ ہم جیسے لوگ بھی تھک گئے ہوتے، ہے نا ــــ؟

زندگی کے نشیب و فراز کو پھلانگتی رہی۔ دھوپ چھاؤں سے بلا معاہدہ جنگ کرتی رہی۔ کم عمری کی شادی اور پھر بچوں کا سلسلہ ...... بظاہر ایک وقفہ سا رہا، لیکن میں نے لکھنا ترک نہیں کیا، کچھ نہ کچھ ضرور لکھتی رہی۔ میں تقیہہ خاندان کی بہو ہوں، یہ خاندان یقیناً اچھا ہے، مگر اُس شاہی محل کی طرح جہاں تازہ ہوا کو شیشے کی دیواروں سے روک دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب ہم بہت زیادہ پیاس میں پانی سے بھرا گلاس ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی جائیں لیکن اس کوشش میں ہمارا دم گھُٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا۔ اور میں نے اس شیشے کی دیوار پر اپنا لبریز گلاس دے مارا ...... میں خوشبودار نم ہوا میں بھیگنے لگی۔ جو برسوں سے شیشے کی دیوار کے پیچھے رُکی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔ سیدھی سادی اُردو زبان میں لکھے گئے ان افسانوں کو میں نے دل و دماغ میں محفوظ رکھا تھا، سوچا کہ ان افسانوں کو اگر میں کاغذ پر بکھیر دوں تو شائد کچھ رنگ پیدا ہو، وہ رنگ جہاں سانسوں کی گرمی، دل کی دھڑکن ہمیں زندگی کا ثبوت دیتی ہے۔ افسانوں میں پھول اور کانٹے، شعلے اور شبنم، رنگ و بو، اندھیرے، اُجالوں کے علاوہ قارئین اس میں حالات کی پستیوں

اور حوصلے کی بلندیوں کو بھی محسوس کریں گے۔ ٹھوکروں سے پاؤں زخمی تو ہوتے ہیں، مگر راستے کے وہ پتھر بھی ہٹ جاتے ہیں، جو دشواریٔ راہ کا سبب ہوتے ہیں۔ میں زخمی پاؤں سے ٹھوکریں لگا کر ان پتھروں کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو سکی یا نہیں ؟ یہ فیصلہ معزز قارئین ہی کر سکیں گے۔

"اب کے برس" شاعری کے مجموعے کے بعد افسانوں کا مجموعہ "آس پاس" پیشِ خدمت ہے۔ میں اپنی مددگار ہستیوں کی احسان مند ہوں اور ہمیشہ رہوں گی کیونکہ ان ہی ہستیوں نے تو مجھے بیساکھیوں کے بغیر چلنا سکھایا ہے۔ میں فرشِ گل پہ چلوں یا خار دار پگڈنڈیوں پر، ان معاون ہستیوں کے سائے ہمیشہ میری رہنمائی کرتے رہیں گے۔

اللہ سبحانہٗ تعالیٰ میرے محسنوں کو عمرِ طویل، صحتِ کاملہ اور دوجہاں کی خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین !

فاطمہ تاج

شمع جلتی رہی

عرب قبیلے کے اُس سردار خاندان کے برتن ہی سونے چاندی کے نہ تھے، وہاں مرجان اور موتی سے سجے بستر بھی تھے، سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے زرّین کام کے لباس بھی تھے، یاقوت و زمرّد کے زیورات سے سجی ہوئی اس خاندان کی شہزادیاں "کوہِ قاف" کی پریوں سے بھی کچھ زیادہ حسین تھیں۔ اس خاندان کے تین روشن چراغ تھے۔ حسین آمری، حسن آمری، قاسم آمری حسنِ یوسف رکھنے والے حسین ترین شہزادے، شمشیر زنی اور گھوڑ سواری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ تین منزلہ اس محل میں ایک راستہ ایسا بھی تھا جہاں پر یہ بھائی اپنا گھوڑا لے جایا کرتے۔ شیش محل کے رنگین آئینوں میں ان کے عکس نکھرے ہوتے والدہ عالیہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ پنکھا جھلتی کنیزوں کے درمیان حور کی طرح زرین مسند سے لگی بیٹھی رہتیں یہ شیش محل جنت سے کم نہ تھا، حسن اور حسین میں اکثر جھگڑا ہو جاتا قاسم سب سے چھوٹے تھے اور بہت ہی معصوم بھی، حسن منچلے تھے لیکن ان کی خصوصیت یہ تھی کہ نیلی سمندر جیسی شفاف آنکھیں اور شہابی رنگ، عنابی ہونٹ قد و قامت میں سارا خاندان مشہور تھا دور، دور تک ان کے حسن اور ان کی دولت عزت و شجاعت کے چرچے تھے، ابھی یہ بھائی کم عمر ہی تھے کہ والد کا انتقال

ہوگیا۔ ماں نے تینوں کو سمیٹا، دولت کی کمی تو نہ تھی جو تکلیف ہوتی، زندگی گذرنے لگی، موسم بہار کی ہواؤں میں کچھ گرمی سی آنے لگی تھی، پتے ابھی ہرے تو تھے لیکن شادابی کم ہونے لگی تھی، اچانک آندھی کے زوردار جھکڑ سے فضا میں بھنور بننے لگے ملک میں انقلاب آیا، عوام پر ظلم ڈھائے جانے لگے ان نوعمر لڑکوں نے تلواریں سنبھال لیں اور مردانہ وار مقابلہ کرنے لگے۔ ایک دن آبادی سے دور حسن تنہا اپنے گھوڑے پر جا رہے تھے انھیں کچھ لوگ نظر آئے تین آدمی ایک آدمی کو پکڑے ہوئے تھے اور چوتھا اسے کوڑے مار رہا تھا حسن برداشت نہ کرسکے میان سے تلوار نکالی اور ظالموں پر ابابیل کے لشکر کی طرح ٹوٹ پڑے آدمی دشمن کے تھے اس وقت تو بھاگ گئے لیکن نئی حکومت کے نئے حکمرانوں نے حسن کو گرفتار کرلیا اور جیل میں ڈال دیا چودہ سال کے اس شہزادے کو خمیری روٹی اور دال، مٹی کے برتن میں دی جانے لگی۔ حالات کے پیش نظر والدہ عالیہ اپنی کنیزیں اور جواہرات کے صندوق لے کر دوسرے ملک میں پناہ لینے نکل پڑیں دوسرے بیٹے کہیں روپوش ہوگئے جب نئے حکمرانوں کو پتہ چلا کہ عرب سردار قبیلہ کی شہزادی نقل مقام کررہی ہے تو ان کی ٹرین پر حملہ کرکے سب کو گرفتار کرلیا۔ خزانے لوٹ لئے گئے۔ شہزادی اور کنیزوں کو شہر سے دور جیل میں نظر بند کردیا حسن موقع پا کر جیل سے بھاگ گئے ماں کے بارے میں سنا تو پریشان ہوگئے۔ صدری کے اندر سلی ہوئی اشرفیوں نے بہت ساتھ دیا آخر ایک بندرگاہ پر ایک ملاح نے انھیں سرحد پار کروادی وہ

بھوکے پیاسے جب وہاں پہنچے تو ان کے ایک دوست نے بتایا شہزادی عالیہ تین دن پہلے ہی اس صدمہ سے انتقال کر گئیں چالیس دن جیل میں گذارنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

حسن دل برداشتہ ہو گئے انھوں نے اپنا حلیہ بدل ڈالا، ڈاڑھی بڑھالی کیوں کہ ان کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی تھی کسی طرح دوسرے قبیلے میں پناہ لی اور وہاں کی ایک حسین دوشیزہ سے شادی کر کے ہجرت کے لئے آگے نکل گئے۔ دو سال بعد انھیں ایک لڑکی ہوئی جس کا چھ ماہ بعد انتقال ہو گیا اور اسی غم میں کچھ دن بعد ماں بھی مر گئی حسن بے انتہا مغموم رہنے لگے آنے جانے والے مسافروں کے ذریعہ ایک دوست کا پتہ معلوم ہوا انھوں نے بصرہ سے خط بھیجا، جواب بھی آگیا جس میں بڑے بھائی حسین کے وہیں رہنے اور نئی حکومت سے صلح کر لینے کی اطلاع تھی اور سب سے چھوٹے بھائی قاسم کے اردن چلے جانے کی اطلاع تھی حسن اپنے ہی وطن میں لٹ چکے تھے وہ دوبارہ وطن لوٹنا نہیں چاہتے تھے ان کے محل پر بھی قبضہ کر لیا گیا تھا تمام باغوں اور دوسری جائیدادوں کو بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

حسن نے ایک اور عرب قبیلے کی بیوہ سے شادی کی مگر کچھ دن بعد ہی طلاق ہو گئی۔ حسن پھر تنہا رہ گئے ایک اور بہت ہی بڑے گھرانے کے سردار کی بیٹی بیوہ ہو گئی تھی حسن کے چرچے عام تھے حسن نے پیغام بھیجا جو فوراً قبول کر لیا گیا، بیوہ کے سابقہ شوہر کا پیارا سا ایک چار سال کا بچہ

بھی تھا حسن لے بیٹے کی طرح پرورش کرنے لگے اور ہر دو چار سال بعد نقلِ مقام کرتے ہوئے بیوی اور بیٹے کے ساتھ ہندوستان پہنچ گئے اور حیدرآباد میں آکر بس گئے ۔

حمیدالدین خان کا اون کا کاروبار دلی میں زوروں پر تھا دونوں لڑکیوں کی شادی صرف گیارہ اور بارہ سال کی عمر میں کردی حسین بیٹیاں تو یوں بھی بٹھائے رکھنے کے قابل نہیں ہوتیں اور پھر یہاں تو پڑھائی لکھائی کا بھی تصور نہیں تھا یہ حق صرف مردوں کے لئے محفوظ تھا، کبریٰ خاتون کی شادی ایک مولوی گھرانے میں ہوئی جہاں تعلیم وتدریس فقہ وحدیث کے اجالے پھیلے ہوئے تھے صفورا خاتون کی شادی ایک بہت ہی نیک، تجارت پیشہ گھرانے کے لڑکے یعقوب خان سے ہوئی یہ لوگ تمباکو کا کاروبار کیا کرتے تھے اور جے پور میں رہتے تھے کبریٰ خاتون شوہر کے ساتھ دلی میں ہی رہتی تھیں ۔ صفورا خاتون کو سات بچے تھے جن میں سے چار کا انتقال ہوگیا تھا اور تین بچ گئے تھے اسماعیل خان، اسحٰق خان اور سارہ خاتون، یعقوب خان نے اپنی بیٹی کی شادی بھی اپنی برابری والوں میں ہی کی ۔ اچانک 1947ء کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوگئی ۔ یعقوب خان کے کارخانے کو آگ لگادی گئی اور انھیں قتل کردیا گیا، پنکھے سے رسی باندھ کر ستون سے لٹکتے ہوئے صفورا خاتون اور ان کے بیٹوں نے جان بچائی اور پھر وہاں سے بھاگ نکلے صفورا خاتون اپنے بیٹوں کے ساتھ ٹرین میں چڑھ گئیں بیٹے سامنے والی ٹرین میں چڑھ

گئے لیکن صفورا خاتون نے دیکھا جس ٹرین میں ان کے لعل چڑھے تھے وہاں سے خون کی ندی بہہ رہی تھی وہ تڑپ گئی ان کی ٹرین تو کھسک پڑی تھی کسی طرح شہر حیدرآباد پہنچی تو یہاں بھی آصفیہ دور دم توڑ رہا تھا وہ مہاجروں کے ساتھ ہو گئیں جہاں کچھ منہ بولے بھائی بہنوں نے انھیں دلاسہ دیا لیکن وہ غیرت دار خاتون تھیں کب تک خیرات کھاتیں منت سماجت کرکے لوگوں سے کام مانگا ایک صاحب محمد جاوش نامی شخص نے ان سے پوچھا کیا وہ کھانا بنا کر دیں گی، ؟ انھوں نے کہا ہاں ! اور پھر محمد جاوش صفورا کو لے کر اس عمارت میں آئے جہاں حسن تنہا رہ رہے تھے کیوں کہ ان کی وفادار بیوی کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا، بیٹا سمجھدار ہوا تو اُسے اپنے وطن بھجوا دیا تاکہ وہ اپنے چچاؤں سے اپنا حق وصول کرے حسن خود پکا کر کھایا کرتے تھے۔ سرکار کی حکومت نے انھیں وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو انھیں کافی ہو جاتا، صفورا خاتون گھر کے سب کام کرتیں پھر سامان کے کمرے میں جا کر سو جاتیں ایک بار محمد جاوش نے ان کو نیند کے عالم میں بے پردہ دیکھ لیا گھونگھٹ چہرے سے ہٹ گیا تھا اور چاند چمک رہا تھا سامنے جاوش حسن کے پاس گئے اور کہا حسن ! میرا کہا مانو یہ بیوہ ہے، جوان ہے، حسین ہے تم بھی تنہا ہو نکاح کرلو اللہ اجر دے گا ورنہ اس خاتون کا کیا ہوگا؟ کسی طرح حسن راضی ہو گئے اور صفورا خاتون کو سمجھا کر نکاح کر لیا ـــ اچانک معلوم ہوا کہ مہاجروں میں صفورا خاتون کو پولیس تلاش کر رہی ہے ۔ پتہ چلا کہ صفورا خاتون بنت حمید

حمید الدین خان کی تلاش ہے پولیس آئی حسن نے دروازہ کھولا پولیس کے ساتھ دونوں آگے آئے پیچھے سے صفورا خاتون نے سر اٹھا کر دیکھا اور بے اختیار ہوگئیں، ان کے دونوں بیٹے ان کے سامنے کھڑے تھے جو فسادات میں مرے نہیں تھے کسی طرح وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے تھے وہاں سے ماں کو تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے تھے ماں بیٹوں کے درمیان اشکباری کا سلسلہ جاری تھا حسن بھی رو پڑے۔ جب غم کا سیلاب تھما تو ماں نے تفصیل بیٹوں کو سمجھائی، مجبوریاں بتائیں لیکن بیٹوں کو اپنا سوتیلا باپ گوارا نہ ہوا وہ لوگ پھر لوٹ گئے ماں بلکتی رہی، حسن نے بہت سمجھایا گلے لگایا لیکن وہ نہیں مانے کچھ عرصہ اسی طرح گذر گیا صفورا خاتون نکاح کرکے پچھتا رہی تھیں کہ ان کے بیٹے ان سے دور ہوگئے۔ پاکستان سے خط آیا جس میں سارہ اور اس کے شوہر اور کبریٰ خاتون اور ان کے بیٹے کے بارے میں لکھا تھا جو سب کراچی پہنچ گئے تھے کبریٰ خاتون کے شوہر بھی شہید کر دیئے گئے تھے اور وہ رو رو کر اپنی بینائی کھو چکی تھیں۔

صفورا خاتون مجبوراً زندگی گذار رہی تھیں حسن اپنی بیوی کا رونا دھونا پسند نہیں کرتے تھے۔ پولیس ایکشن شباب پر تھا۔ شہر کی فضا بوجھل تھی رات کے ختم ہوتے ہوئے لمحوں کے قریب ایک ننھی سی رونے کی آواز محلے کی بوجھل فضا میں گونج اٹھی، گھر میں چراغ بھی نہ تھا، کھانے کا کچھ سامان بھی نہ تھا گلی میں سے پچھواڑے کے دروازے سے دایا آگئی تھی، صفورا خاتون نے حسن کی بیٹی کو جنم دیا تھا، حسن کی زندگی میں چراغ جلایا تھا اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر، اپنے شیر

جیسے بیٹوں کو بہ ظاہر فراموش کر کے حسن کو بیٹی دی تھی اپنی یادگار، اپنے اوپر کئے گئے احسان کا بدلہ ....

اور پھر اس کے بعد صفورا اور حسن کے درمیان خلیج سی حائل ہونے لگی اب حسن کے بھائی حسین نے لوگوں کے ذریعہ اپنے بھائی کو رقم بھجوانی شروع کی جو وہاں کی نئی حکومت نے انھیں لوٹا دی تھی۔ حسن کے دن بدل گئے شمع کی پیدائش کے بعد گھر میں ہن برسنے لگا لیکن میاں بیوی کے تعلقات بگڑنے لگے آخر شمع سات سال کی ہوگئی اور حسن نے صفورا کو طلاق دے دی۔ صفورا نے جگر کے ٹکڑے کو گلے لگایا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ چومتی رہی اور اپنے بیٹوں کے پاس کراچی چلی گئی۔ سات سالہ شمع باپ سے کیسے پلتی ہے انھوں نے ایک آیا رکھی جو ہر طرح شمع کا خیال رکھتی اور شمع پلنے لگی، بڑھنے لگی۔ جلنے کے لئے ....!

شمع کم سنی سے ہی حالات کی تپش سہنے لگی۔ اس کو سنوار سنوار کر صدقے ہونے والی ماں کی نظروں کی کمی کا احساس سوگوار کر دیتا لیکن اپنے رنج و غم کا اظہار باپ کے سامنے کبھی نہ کرتی کہ کہیں اس کے ابّا بھی ملول نہ ہو جائیں وہ راتوں کو اپنے بستر میں پڑی خوب روتی، ہچکیاں لگ جاتیں تو رضائی کا یا ڈوپٹہ کا کونہ منہ میں ٹھونس لیتی اور آواز دبانے کی حتی الامکان کوشش کرتی دن تو بچپن کی شرارتوں، شوخیوں کے ساتھ گذر جاتا اور رات اپنے تابکاری اثرات لئے شمع پر طاری ہو جاتی، وہی تنہائی کا احساس، وہی کمی کا احساس اس کے لئے اس کے ابا نے کوئی کمی نہیں کی تھی ڈھیروں قیمتی ملبوسات

دن میں چار، چار دفعہ بدلوئے جاتے رہا تھی دانت کے دو صندوقوں میں اس کا زیور پڑا رہتا لیکن اُسے ان چیزوں سے واسطہ ہی نہ تھا ماں کی پیار بھری نظریں یاد آ آکر اُسے تڑپا دیتیں۔

حسن کی بے انتہا دولت اور حسین بیٹی کی شہرت کے چرچے پر لگا کر اڑنے لگے، حسن نے اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا لیکن وقت نہ جانے کیوں مسکرا رہا تھا؟ تقدیر اپنی جگہ کھلکھلا رہی تھی شمع کے لئے بے شمار رشتے آنے لگے ہر شخص شمع کا طالب تھا دولت اور حسن انسان کی کمزوری ہے لیکن ایسا کوئی نہ تھا جو بے غرض رہ کر شمع کو چاہتا یا مانگتا۔ بے غرض چاہت یوں بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے، تنہا حسن بیٹی کی فکر میں آخر بیمار ہو گئے ایک قریبی دوست امتیاز صاحب سے ان کے لڑکے کے بارے میں بات کی اور رشتہ طے ہو گیا لیکن شادی سے کچھ عرصہ پہلے ہی حسن انتقال کر گئے شمع، شمع حسرت بنی دنیا کی بے ثباتی پر حیران رہ گئی اس کے معصوم ذہن نے ابھی تک اس یتیمی کو قبول نہیں کیا تھا' ابھی تو اس کے کھیلنے کے دن تھے کہ کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی بساط الٹ گئی، مہرے بکھر گئے' بازی نہ تو ہاری گئی نہ جیتی گئی حسن کے دوست امتیاز صاحب نے ہی باپ بن کر اپنے لڑکے اعجاز سے شمع کی شادی کر دی۔ شمع ہر رنگ میں جلتی رہی، ماں کی جدائی باپ کا غم، اور شادی جیسے حادثوں سے تنہا گذرتی رہی اعجاز کے گھر والوں کو بس دولت سے محبت تھی انھوں نے نادان شمع کو شعور کی طرف جانے نہیں دیا اس کی پرانی سہیلیوں اور

ملنے والوں سے ملنے کو منع کر دیا۔ شمع باپ کے گھر میں جو "مرکزِ حیات" تھی تو سسرال میں "بارِ حیات" بن گئی پھر بھی مسکراتی ہوئی تنہائی کے احساس کو اپنے اندر لئے جیتی رہی شوہر کی محبت نے دلاسہ تو دیا مگر وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو سکی کراچی سے اطلاع ملی کہ شمع کی والدہ گذر گئیں لیکن شمع کے لئے کوئی فرق نہیں پڑا وہ تو پہلے ہی اس کے حق میں مر سی گئی تھیں۔ شمع نے چوتھے حادثے کی طرف قدم بڑھایا یعنی شمع ماں بن گئی اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا وہ کئی بچوں کی ماں بنی رفتہ رفتہ شعور بھی آتا گیا، ڈھنگ سے بچوں کی پرورش، سسرال والوں کے زہر میں بجھے تیر سہتے ہوئے آنے جانے والے مہمانوں کی خاطر داریوں میں دن گذرنے لگے شمع کو صرف جلنا آتا ہے سو وہ جلتی رہی کبھی سحر کا انتظار نہیں کیا امتیاز صاحب بہو سے بڑی محبت کرتے تھے ان کی شفقتوں کے سائے میں کچھ علمی تربیت پروان چڑھنے لگی شمع کا قلم آگ اُگلنے لگا گھر والوں کو سخت ناپسند ہوا کیوں کہ وہاں امتیاز صاحب کے علاوہ کوئی بھی اتنا فراخ دل نہ تھا جو اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا، شمع نے ہمیشہ دوسروں کی خوشی کو عبادت سمجھا تھا اور یہی کرتی رہی اس نے علمی ادبی شوق ترک کر دیا برسوں بیت گئے، بچے جوان ہو گئے امتیاز صاحب کافی ضعیف ہو چکے تھے آخر ایک دن شمع نے پانچویں حادثہ کو بھی گلے لگا لیا امتیاز صاحب کا انتقال ہو گیا، شمع تڑپی، بھڑکی، بجھ نہ سکی اس کا وہ سایہ دار شجر بھی نہ رہا جو اس کی یتیمی اور لاوارثی کے احساس سے ہمیشہ دور رکھتا تھا وہ اب کوئی شکایت کسی سے نہیں

کرسکتی تھی، کوئی فریاد بھی نہیں کرسکتی تھی کسی خواہش کا اظہار بھی نہیں کرسکتی تھی شمع کو احساس ہوا کہ وہ خاندان کی سب سے بڑی بہو ہے وہ اب بہت بڑی ہوگئی ہے اس سے بڑے اب اس کے سر پر نہیں رہے اب اُسے اپنے بابا کی طرح سب کو سمیٹنا تھا، شمع جلتی رہی، روشنی دیتی رہی۔

اعجاز نے شمع کی دولت پوری طرح اپنے قبضہ میں کرلی تھی شمع کی فکر اب اس کو بالکل نہیں تھی۔ شمع نے اپنی گھٹن سے نجات پانے کے لیے دوبارہ علمی ادبی شوق کو اپنایا وہ ہاتھ میں قلم اٹھا چکی تھی کبھی نہ رکھنے کے لئے، اس نے بے ربط تحریروں میں اپنی زندگی کے مسلسل حادثات کی کڑیاں جوڑنی شروع کردیں کچھ خواتین کی دوستی نے مدد کی وہ باقاعدہ شاعرہ ہوگئی۔ مگر اپنا مقام بنانے کے لئے کسی طرح ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے کوئی ایسا رہنما نہیں تھا کوئی چارہ گر نہیں تھا شمع اکیلی ہی جلی جارہی تھی صحت بھی دن بہ دن گرنے لگی تھی کافی کمزور ہوگئی تھی اس کی لو کانپ رہی تھی اچانک شمع کی زندگی میں چھٹا حادثہ ہوگیا۔ اس کا کلام اخباروں رسالوں کی زینت بننے لگا۔ ادب دوستوں نے کافی سراہا۔ شمع مضامین اور افسانے بھی لکھنے لگی۔ شمع کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا وہ زندگی سے بےزار تھی مگر وہ اب جینا چاہتی تھی وہ اپنی تاریخ بنانے پر تلی ہوئی تھی شمع جلتی رہی، اجالے بڑھتے گئے، شمع کے اجالوں سے ہی رات روشن ہوتی ہے اور سحر سے زیادہ حسین ہوتی ہے۔

"قصہ سائے کا"

گھر کی پرانی خادمہ وزیراًؔ بی بی اماں کے سامنے بیٹھی بکے جا رہی تھی بی بی اماں! میری بھانجی بڑی خوب صورت تھی گوری گوری لمبے اور سنہرے بالوں والی، لیکن اس پر "سایا" ہو گیا تھا سو وہ بن بیاہی رہ گئی کہیں اس کا رشتہ نہ جم سکا آخر بے چاری کو "جن" نے اپنے پاس بلا لیا اُسے "جن" ہمیشہ "سائے" کی شکل میں نظر آتا تھا" بی بی اماں سارا واقعہ حیرت سے سن رہی تھیں آخر میں بولیں "چلو اب کام پر لگ جاؤ دوپہر ہونے والی ہے آج نرگسی کوفتے بنانے ہیں" اور بات ختم ہو گئی۔ چھ سالہ "بانو" وہیں بیٹھیں اپنی گڑیا سنوار رہی تھی اور وزیراًؔ کی ساری باتیں سن چکی تھی خیر کچھ دن گذر گئے۔ ایک دن بارہ بجے چھت سے دوڑتے ہوئے اتر کر بانو اماں کے پاس آئی اور کہنے لگی اماں، اماں مجھے سایا ہو گیا ہے "ہائے میری بچی! اماں نے دل خراش چیخ ماری "وزیراًؔ جلدی آؤ" اماں کی دنیا اندھیری ہو گئی تھی بانو حیران نظروں سے تکنے لگی کہ آخر ایسا بھی کیا؟ معتبر، باوقار اماں، بچوں کی طرح بلبلا رہی تھیں۔ اماں رو رو کر وزیراًؔ کو بانو کا اعلان سنا رہی تھیں وزیراًؔ نے سب کچھ

بچشم نم ۔ ۔نا پھر اپنا چہرہ آنچل سے صاف کرتے ہوئے بی بی اماں کو دلاسا دیا "فکر نہ کیجئے لیسن پڑھ کر دم کریں اور صدقہ اتاریں۔ لیکن وزیراًں نے ایک خدشہ بھی ظاہر کیا کہ نہ جانے وہ سایا پری کا ہے یا جن کا؟ پری کا ہو تو زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اگر جن کا ہوا تو بہت خطرناک بات ہوگی ...... لال دھاڑیں مار کر روتے نگیں بانو بھی ماں کو روتا دیکھ کر بے تحاشہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ اور روتے روتے ہی سوگئی۔ رونا دھونا کم ہوا تو سایا نے ہونے کے امکان واسباب پر غور و خوص شروع ہوا وزیراًں نے کہا" بی بی اماں بانو رانی منگل کے دن پیلے رنگ کا غرارہ سوٹ پہن کر کھلے بالوں چھت پر کھیل رہی تھیں یقیناً جن اور پریوں کا تخت اس وقت گذر رہا ہوگا تب ہی یہ واقعہ ہوگیا" اماں کو بات بالکل سچی لگی وزیراً نے پھر سرگوشی کی" ویسے میں تو کھوتگی بانو بیٹا کی پیشانی پر جب پسینہ آتا ہے تو بانو بیٹا بالکل چڑھتے ہوئے سورج کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں چوں کہ سورج آگ کا گولہ ہے اور جن بھی آگ سے بنے ہیں اس لئے یہ میل ہو جاتا ہے "وزیراً نے مخلوق اور تخلیق کائنات کی ماہیت پر جیسے لکچر دے ڈالا......

دن ڈھلا شام ہونے لگی۔ پھر بانو چھت پر گئی اماں نے فوراً وزیراً کو بھیجا کہ بانو کو اکیلا نہ چھوڑا جائے وزیراًں نے بانو سے پوچھا" رانی بیٹا ایک بات بتاؤ وہ سایا کیسا تھا؟ بانو نے بھولپن سے کہا بس! کالا سا اور جب میں نے اُسے ڈرایا تو وہ بھی مجھے ڈرانے لگا"۔ جب میں نے لکڑی اٹھائی تو اُس نے بھی لکڑی اٹھائی، میں بھاگنے لگی تو وہ میرے ساتھ بھاگنے لگا

ہائے بیٹا رانی جلد اب نیچے چلو تم چھت پر کبھی نہ آنا " وزیراً تاکید کی اور یہ لوگ نیچے آ گئے رات کا کھانا کھانے کے بعد " یٰسین " پڑھ کر دم کیا گیا بانو کو دم کا پانی بھی پلایا گیا سرہانے مٹی کی سینک میں صدقہ بھی رکھا گیا جس میں سرخ گلاب کا پھول اور زعفرانی میٹھے چاول بھرے تھے ۔ آدھی رات کو سوتے ہوئے اچانک بانو کی آنکھ کھل گئی سرہانے میٹھے چاول اور گلاب کی خوشبو نے بے قرار کر دیا بانو نے بے تکلف میٹھے چاول کھالئے اور پھر سو گئی ۔ اماں ، وزیراً اور بشیرہ (وزیراً کی بیٹی جو بانو کی ہم عمر تھی) پاس ہی سو رہی تھی ۔

صبح ہوئی سب سے پہلے اماں اٹھیں دیکھا ۔ بانو کے سرہانے کی سینک خالی ہے فوراً انھوں نے وزیراً کو جگایا وزیراً نے سر پیٹ لیا " بی بی اماں یہ جن بہت خطرناک ہے اسی نے اپنے طور پر منہ میٹھا کر لیا ہے اب بانو بیٹا کا گھر کیسے آباد ہوگا ؟ وزیراً کی آنکھیں بدلتی جا رہی تھیں ۔

اماں اور وزیراً کی دہشت زدہ چیخوں سے ابا بھی اپنے کمرے سے نکل آئے اور حال پوچھا صورتِ حال کافی ابتر تھی جب یہ معلوم ہوا کہ ان کی اکلوتی بیٹی پر جن کا سایا ہوا ہے وہ بے اختیار ہنس پڑے اور عورتوں کی کم عقلی کا رونا رو کر واپس اپنے کمرے میں چلے گئے ۔ خدا خدا کر کے دوپہر ہوئی سب اپنے کاموں میں لگے تھے بشیرہ کو بانو پھر چھت پر لے گئی کھیلتے کھیلتے رقص کی سوجھی چھت کی دیوار پر بانو نے سائے کو لہراتے دیکھا اور بشیرہ کو ایک طرف چوکی پہ بٹھا دیا کہ وہ تماشائی بنے اور بانو فلم کے ہیروئن بن کر ناچ دکھائے گی ۔ پروگرام شروع

ہوا بانو نے پہلے اپنی پازیب بجائی اور پھر گانے لگی...

چھم چھم باجے پائل موری .... آجا چوری چوری....

بانو شاخِ گل کی طرح لچک رہی تھی اور سائے کو دیوار پہ رقص کرتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی گانے کی سریلی آواز فضا میں گونج رہی تھی وہ بالکل اپنے رقص و نغمات میں گم تھی دو چوٹیاں کھل گئی تھیں رقص عروج پہ تھا کھلے بال لہرا رہے تھے پازیب جھنجھنا رہی تھی بانو گیت میں مدہوش تھی سایا دیوار پہ رقصاں تھا وزیراً گانے کی آواز سن کر اوپر آئی اور الٹے پاؤں بی بی اماں کے پاس دوڑ گئی " بی بی اماں .... بی .... بی .... اماں .... ل وہ .... یہ وہ.....

وزیراً حواس باختہ تھی الفاظ ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔ کیا ہوا؟ اماں چلائیں ۔ بی بی اماں "جن" وارد ہو گیا ہے وزیراً کانپ رہی تھی اماں دوپٹہ کی پروا کئے بغیر چھت پہ دوڑیں نقشہ دیکھا جن وارد ہو چکا تھا جن ان کی اکلوتی بیٹی کو اپنے پاس بلا رہا تھا....... آجا چوری چوری .... بانو اپنے قد کے برابر کھلے بالوں میں جھوم رہی تھی پازیب نے سُر سنبھال لئے تھے چھم... چھم... چھم... اماں وہیں گر کر بے ہوش ہو گئیں وزیراً بھاگی صاحب جی .... صاحب جی کہتے ہوئے مردانے میں پردے کا لحاظ کئے بنا گھس پڑی روداد ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سنائی ابا دوڑ کر اوپر پہنچے .... بانو .... بانو ابا کی آواز گیت کی لے اور پازیب کی چھم چھم پر بہر حال بھاری تھی، بانو کے تھرکتے قدم رک گئے رقص کے دوران لہراتے ہوئے بال آخر تھک کر بانو کی پشت پہ بکھر گئے بانو کے سُرخ

سُرخ چہرے پر پسینے کی بوندوں نے ابا کے دل کو نرم کر دیا انھوں نے آگے بڑھ کر
بانو کو سینے سے لگایا اور پیار کیا اماں کے چہرے پر پانی کی چھینٹیں ماری گئیں
ہوش آچکا تھا مگر وہ اب بھی رو رہی تھیں وزیراً تے ان کے اوسان خطا کر رکھے
تھے اماں نے بانو کے ابا سے کہا خدا کے لئے کچھ کیجئے آپ کو پاک پروردگار کی قسم ہے
میری بچی کے لئے کچھ کیجئے اس کا سایا دُور ہو جائے میں پانچ سو فقیروں کو کھانا
کھلاوں گی بے حساب شکرانے کی نمازیں ادا کروں گی زار زار روتے ہوئے اماں
منتیں مان رہی تھیں وزیراً نے ہاں میں ہاں ملائی اور کہا ہاں! صاحب جی
بانو بیٹا کا علاج کوئی مولوی ہی کر سکتا ہے صاحب جی! میری بھانجی کے
ساتھ بھی یہی ہوا تھا علاج نہ کرانے سے جن اُسے لے گیا دو عورتوں کی آہ وزاری
کے آگے ابا کی بساط ہی کیا تھی؟ انھوں نے تسلی دی اور شام کو ایک مولوی صاحب
بلوائے گئے بڑی بڑی زلفیں، گلے میں مختلف رنگین مالائیں سُرخ آنکھیں ان کے
پیچھے اسی طرح کا ایک نوجوان جس کے ہاتھ میں عود دان اور مور کے پروں کا گٹھا لئے ہوا تھا
دالان میں بیٹھ کر مولوی صاحب کچھ پڑھنے لگے اور بانو کو اشارے سے
اپنے پاس بلایا مگر بانو نے اس طرح خوفناک وضع قطع کا آدمی کبھی نہیں دیکھا
تھا وہ ابا سے اور بھی چمٹ گئی وزیراً نے چلمن کے پیچھے بیٹھی بی بی اماں سے کہا
جن وارد ہے نا اس لئے مولوی صاحب کے قریب نہیں جارہی ہے" اماں کو یقین
تو تھا مگر اب یقین کامل ہو گیا بہر صورت عود دان میں بہت سی آگ
دہکا کر بہت سارا عود ڈال کر دھواں دیا گیا یہاں تک کہ گھر والوں کا دم گھٹنے

لگا بالو پریشان ہو کر رونے لگی وزیراً کی آواز آئی دیکھا اب کس طرح جن رونے لگا ہے ؟ جا کمبخت جا تیری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی ؟ (جیسے کہ جن وزیراً کا تابعدار ہو) بی بی اماں سسک رہی تھیں بالو اس وحشت ناک منظر سے پریشان، ابا کچھ عجیب سے عالم میں کھڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے خیر! کچھ دیر بعد مولوی صاحب کچھ ہدایتیں دے کر چلے گئے دوسرے دن کیفیت کی اطلاع انھیں کروانی تھی تین سو روپے کرایہ آمد و رفت کے بھی لے گئے ۔ جن اُتارنے کا معاوضہ مولوی صاحب بعد میں اپنی مرضی سے لیا کرتے تھے ۔

رات ہوئی مولوی صاحب کی ہدایت کے مطابق آج لائٹ نہیں کھلنی تھی بلکہ انھوں نے کچھ چراغ دیئے تھے انھیں روشن کرنا تھا، چراغاں کر دیا گیا بالو کے لئے یہ نیا تجربہ تھا بالو بہت خوش تھی بشیرو کو ساتھ لے کر اس کمرے میں گئی جہاں اکثر مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا بالو بہت ہی خوش تھی آخر جشنِ چراغاں تھا کیسے خوش نہ ہوتی ؟ بشیر پھر تماشائی بنائی گئی بالو نے گیت شروع کیا ؎

؎ جادو گر سیّاں چھوڑ دو موری بیّاں۔
ہو گئی آدھی رات اب گھر جانے دو

چراغوں کے درمیاں رقص کرتی ہوئی بالو کا سایا دیوار پر لہرانے لگا سایا یعنی کردار ہو گیا رقص عروج پر پہنچا اماں اور وزیراً نے مولوی صاحب کی ہدایت کے مطابق دخل اندازی بالکل نہیں کی اور باہر دالان میں ہی وظیفہ پڑھتی رہی گیت ختم ہوا۔ دوسرا شروع ہوا ؎

ے ہوا میں اُڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا ہو جی ہو جی ...

اور کامدانی کے ننھے سے سرخ دوپٹہ کو جب بالو نے لہرایا تو چراغ کے شعلہ نے آنچل کو ذرا سا چوم لیا۔ غضب ہو گیا دوپٹہ جلنا شروع ہوا بشیرہ چلّانے لگی بالو تیزی سے چکر کھانے لگی اماں کے کانوں میں وزیراً کی آواز آئی "بی بی اماں مبارک ہو سایا جل گیا ہاں بی بی اماں سایا جل گیا جب جن جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی چیز جلا کر جاتا ہے بالو کا دوپٹہ اس کے چکر کھانے سے نیچے گر کر خاک ہو چکا تھا اور بالو پر ذرا بھی آنچ نہیں آئی تھی بقول وزیراً کے مولوی صاحب کا عمل با اثر تھا۔ دوسری صبح مولوی صاحب کو پھر بلایا گیا سارا واقعہ سنایا گیا مولوی صاحب خوش ہو کر بولے معصوم بچی کا معاملہ ہے وہ کچھ بھی رقم نہیں لیں گے البتہ بچی جو کپڑے اور زیور جن کے جاتے وقت پہنے ہوئے تھی وہ سب دیدیں تاکہ وہ "مکمل اتارا" کر دیں۔ اماں کے تیور بدل گئے یہ کس طرح کا مولوی ہے جو میری بچی کے یہ پازیب یہ جڑاؤ ٹیکہ اور موتی والے کانوں کے جھمکے یہ ستاروں والا گلے کا ہار اور یہ یاقوت کی چوڑیاں مانگ رہا ہے یہ کیسے ممکن ہے؟ میں اتنے قیمتی زیور اپنی بیٹی کے تہیں کا بنوا کر نہیں دے سکتا اماں بدل گئیں۔ وزیراً نے دیدے پھاڑ دیئے تھے بالو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا ابا کو غصہ آیا مگر پی گئے اور مولوی صاحب کو سمجھایا کہ وہ چاہے جتنے روپے لیں لیکن بالو کا زیور نہ مانگیں لیکن مولوی صاحب جن کی طرح اڑ گئے کہ جو مانگا ہے وہی لیکر جاؤں گا۔ آخر مجبور ہو کر اماں نے روتے ہوئے بالو کی ہاتھ کی چوڑیاں اتارنی چاہیں شریر بالو نے ہاتھ چھڑا لیے

ے چھوڑو موری بیّاں ....

اور پھر اس کے پاؤں تھرکنے لگے ...

ے جادوگرسیّاں چھوڑو موری بیاں ...... پھر وارد ہوگیا ؟

وزیراً چلا پڑی اندر سے گڑبڑ کی آوازیں سن کر مولوی صاحب چونکے وزیراً نے کہا صاحب جی ! مولوی صاحب کو پکڑ لیتے انھوں نے ٹھیک علاج نہیں کیا جن پھر وارد ہوگیا ہے اس بار ابّا کو بہت ہی غصہ آگیا سب سے پہلے مولوی صاحب کو اس طرح جانے کے لئے کہا کہ وہ " یہ جا اور وہ جا " ہوگئے پھر وزیراً کو ایسی ڈانٹ پلائی کہ وزیراً کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے (صاحب جی نے کبھی اسے نہیں ڈانٹا تھا) اور پھر بیگم پر برس پڑے (شائد پہلی بار) بچوں کی شرارتوں سے کوئی یوں خوف زدہ ہوتا ہے کیا ؟ تم لوگ جسے جن سمجھے ہو وہ خود اس کا سایا ہے بانو سایا دیکھ دیکھ کر رقص کرتی ہے۔ خواہ مخواہ گھر میں ہنگامہ مچا ڈالا ۔ اماں آہستہ سے بولیں " لیکن بانو نے خود ہی کہا تھا کہ اسے سایا ہوگیا ہے ؟ ابّا اور بھی چراغ پا ہوگئے ! بچی نے نہ جانے تم لوگوں سے کیا سنا کہ وہ یوں کہہ اٹھی ورنہ اسے کیا ؟ کہ جن کیا ہے اور سایا کیا ہوتا ہے ؟ بانو پیچھے سے آکر ابّا سے لپٹ گئی بولی ابّا ہوتا ہے، سایا ہوتا ہے وہ دیکھئے نا بانو نے دیوار پر اپنا سایا دکھایا جو اپنے ابّا سے لپٹ کر کھڑا تھا ، اماں کی عقل ٹھکانے آگئی وزیراً اب بھی خوف زدہ تھی بشیرہ نے آواز لگائی بانو رانی آؤ کھیلیں

میں تماشائی بنی بیٹھی ہوں اور پالو پھر تھرکنے لگی .... چھم چھم چھم ...
...... باجے پائل موری ..... چھم ......

وہ کرسی کی پشت پر بال بکھرائے سر جھکائے ماضی کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی ساس ماجدہ بیگم وہیں دالان کے کونے پر لگی چلمن ٹھیک کر رہی تھیں کہنے لگی "چار بچوں کی ماں ہو کر بھی عقل نہیں آئی دوپہر کے وقت کھلے بالوں اس طرح اگر بادام کے جھاڑ کے نیچے بیٹھا جائے تو سایا ہونا یقینی ہے بھلا جب آفتاب سر پر ہو بال کھلے رکھ کر یوں سکھائے جاتے ہیں کیا؟ بالو یونہی کھلکھلا کر ہنس پڑی گردن گھما کر زور دار جھٹکا دیتے ہوئے چہرے سے بالوں کو ہٹایا اور پرانی باتیں یاد کر کے بے اختیار قہقہے لگانے لگی ۔ ماجدہ بیگم گھبرا گئی اور فوراً اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا "جن" "پری" کے سائے سے ڈر کر !!!

--

سفید گھوڑا

باہر سے مسلسل "ایک تارا" بجنے کی آواز آرہی تھی۔ بنو سے رہا نہ گیا
اماں، اماں مجھے ایک تارا چاہیئے۔ بنو صفیہ خاتون کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی
اماں نے کہا" اب کیا سر دکھائے گی میرا دن بھر بجا بجا کے؟ بنو نے کہا نہیں اماں میں
تو آپ کے سونے کے بعد بجایا کروں گی۔ صفیہ خاتون مسکرانے لگیں۔ سردار خاں
چلمن اٹھا کر اندر آئے اور ماجرا پوچھا تو صفیہ خاتون نے بنو کا مُدّعا بیان کر دیا۔ سردار خاں
واپس مردانے حصے میں چلے گئے اور نوکر سے کہہ کر اس قبائلی عورت کو اندر بلوا لیا جو
ایک ٹوکرے میں بہت سے "ایک تارے" رکھ کر لائی تھی ایک اس کے ہاتھ میں بھی تھا
جسے وہ مسلسل خوب صورت انداز میں بجا رہی تھی۔ ایک تارا خرید کر بنو کو دیا گیا بنو نے
جیسے ہی بجانے کی کوشش کی بے ہنگم سی آواز نکلی بنو اڑ گئی کہ دوسرا چاہیئے دوسرا لیا گیا
تو وہ بھی فن سے نا آشنا ہاتھوں میں چلّانے لگا اب تیسرے کی باری تھی غرض کہ ہوا
یہ، سارے ایک تارے لے لئے گئے اس کے باوجود بنو کی تسکین نہ ہو سکی ہر

ایک تارہ اس کی خواہش کی گویا خلاف ورزی کرنے پر تُلا ہوا تھا بنو سُر کی تلاش میں ہر ایک تارہ جھنجھوڑ کر رکھ دیتی اور پھر پٹک دیتی اس کے بعد اس سے رہا نہ گیا وہ زار زار رونے لگی سردار خان پریشان سے اندر آئے بیٹی کو پیار کیا سمجھایا منایا مگر وہ تھی سردار خان کی بیٹی کیسے مانتی ؟ کیسے تسلیم کرتی کہ اُسے ساز بجانا نہیں آتا وہ تو سازوں میں عیب نکالنے لگی ماں نے ہزار کوششیں کیں پر وہ چپ نہ ہوئی آخر صفیہ خاتون نے اپنی خادمہ نصیباً سے کہا کہ اس کی بیٹی کو بُلا لائے "دل بہلائی" کریں گے۔

نصیباً کی بیٹی وحیداً بہت اچھا ڈھول بجاتی تھی گانے میں بھی یکتا تھی بہرحال شیریں اور وحیداً آ گئے شیریں وحیداً کی چھوٹی بہن تھی اس کے پاس رہتی تھی بہرحال ڈھول بجنے لگا نصیباً بھی بیٹی کا ساتھ دینے لگی بنو کی سسکیاں رکنے لگیں آنسوؤں سے تر گلنار چہرہ شگفتہ گلاب نظر آرہا تھا بنو نے ایک اور آرڈر لگائی لماں میں تو ناچوں گی ! وہ جو میری سالگرہ میں ثریا آپا ناچی تھیں نا ! وہی گانے پر میں بھی ناچوں گی، اکلوتی بیٹی اور لاڈلی حسین بیٹی کے ناز اٹھانے میں ماں باپ کبھی کوتاہی نہیں کرتے انھوں نے فوراً وہی گیت وحیداً کو گانے کے لئے کہا ؎

من ڈولے میرا تن ڈولے
میرے دل کا گیا قرار رے

گیت شروع ہوا بنو کے پازیب سے سجے پاؤں چھم چھمانے لگے گھیرے والے مہین سفید فراک نے دنیا کی گولائی کا نقشہ بنانا شروع کیا بنو تھرک تھرک کر ناچ رہی تھی ...... میرے دل کا گیا قرار رے .....

وحیدا آ کو گانے کے ساتھ حلق سے بین کی آواز نکالنے کا فن بھی آتا تھا جیسے ہی اس نے بین کی موسیقی شروع کی بنو ناگن کی طرح دونوں ہاتھ اوپر کر کے جھومنے لگی بالکل ناگن کی طرح ۔۔۔۔ بنو کے دودھیا رنگ پر سفید سلمی ستارے والا گھیر دار فراک اور چوڑی دار پاجامہ اور بڑے گوٹے کناری والا چھوٹا سا دوپٹہ جو ماتھے کے جھومر کے ساتھ جمایا گیا تھا ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا سردار خاں نے نظر کی دعا پڑھ کر بیٹی پر پھونکی پیار کیا گیت و رقص کی محفل ختم ہوئی بنو کی ماں نے صدقہ اتارا نصیبا آ نے دعا دی شیرینی اور وحید آ نے انعام لیا اس طرح بنو کا مرجھایا دل پھر سے کھل اٹھا ایک تارے کا غم اب بالکل نہیں تھا اماں نے بیٹی کو سینے سے بھینچ لیا کہنے لگیں، کیسی پیاری پیاری بیٹی ہے میری؟ بالکل پری جیسی، میری بیٹی کے لئے تو سفید گھوڑے پر حسین شہزادہ آئے گا اور بیاہ کر لے جائے گا راج کرے گی بنو میری۔۔۔۔۔۔

بالکل اپنی ماں کی طرح سردار خان چہکے صفیہ خاتون کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ کھل اٹھی اس سات سال کی بنو سے گھر میں کافی شور رہتا تھا جتنی حسین اتنی شریر، اب ماں کی بات سن کر سفید گھوڑے کے بارے میں استفسار کرنے لگی اماں وہ سفید گھوڑا کیسا ہوگا؟ کیا اس کے پاؤں میں گھنگھرو بھی ہونگے؟ ہاں! ہاں ہوں گے ماں نے یقین دلایا اماں! وہ پرحسین شہزادہ بھی کیا میرا دولہا بنے گا؟ کیا اس کے سر پر تاج بھی ہوگا؟ ہاں ہاں یقیناً ہوگا آخر کو وہ شہزادہ جو ٹھہرا بنو سن کر کچھ مطمئن سی ہوگئی اب اس کا ذہن سفید گھوڑے کی طرف دوڑنے لگا تھا کانوں میں ہلکی ہلکی دور سے آنے والی ٹاپوں کی آواز بھی آنے لگی تھی کہ۔۔۔۔۔ اچانک صفیہ خاتون سیڑھیوں پر سے گر پڑیں اور ایسی گریں کہ پھر اٹھ نہ سکی سردار خان نے

عزیز ترین بیوی کو خدا کے اطاعت گذار بندے کی طرح ڈھیروں مٹی تلے دبا تو دیا مگر ایک لمحہ بھی انھوں نے چین کا نہیں گذارا اپنی ساری توجہ بنو کی طرف کردی پڑھائی بھی گھر پر ہوتی رہی قابل اساتذہ مقرر کئے گئے بنو کو شعروشاعری سے بہت لگاؤ تھا ۔

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ

جب وہ اپنی سریلی آواز میں گنگناتی تو سردار خاں کا دل بلک اٹھتا اپنی رفیقۂ حیات کو یاد کرکے آبدیدہ ہوجاتے مگر بنو کو اپنے غم کا پتہ نہ چلنے دیتے ۔یوں ہی شب و روز گذرتے رہے بنو کے کان سفید گھوڑے کی ٹاپوں کو زیادہ ہی سننے لگے تھے مگر حسین شہزادے کا چہرہ ابھی تک واضح نہ ہوسکا تھا' بیوی کے غم اور اکلوتی بیٹی کی فکر نے سردار خاں کو بوکھلا دیا تھا اپنے ایک عزیز دوست مسعود خاں سے وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مسعود خاں نے پہلے ہی سردار خاں سے بنو کو مانگ لیا اپنے بیٹے احسان خاں کے لئے سردار خاں مطمئن تو ہوگئے مگر بیٹی کی لاپرواہ اور حد سے زیادہ بھولی فطرت سے پریشان رہتے رنج والم کا بوجھ تنہا سہتے سہتے سردار خاں کھوکھلے ہوگئے بنو سیانی ہوچکی تھی لیکن طبیعت سے بھولا پن نہیں گیا ذرا بھی سنجیدگی نہیں آئی فکرمند باپ کی قوت برداشت کہاں تک ساتھ دیتی ؟ رات میں اچھے بھلے سوئے لیکن صبح نہ اٹھ سکے سوتے ہی رہ گئے نصیباً دوڑی دوڑی جاکر مسعود خاں کو بلا لائی ڈاکٹر آیا اور یہ اعلان کر گیا کہ چھ گھنٹے پہلے ہی ان کی روح پرواز کرگئی گھر میں کہرام مچا بنو کی سہیلیاں عزیز و محلے دار بنو کی چیخوں سے زار زار رو رہے تھے آخر شوخ بنو نے ماں باپ کے بغیر سانسیں لینی شروع کیں ۔مسعود خاں کو اب بنو کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا وہی اس کے باپ کی جگہ تھے لہٰذا قریبی

دوست ورشتہ داروں کی موجودگی میں بنو کا نکاح ہوگیا رخصتی بیس دن بعد طئے پائی
نکاح کے فوراً بعد بنو بھی اپنی سہیلیوں میں بیٹھی ڈھول پیٹ پیٹ کر گانے لگی ؎

دو ستاروں کا زمین پر ہے ملن آج کی رات

اور جب رات اٹھی تو اپنے بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی میری شادی تو ہوگئی آخر وہ حسین شہزادہ سفید گھوڑے پر کب آئے گا؟ اُسے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی وہ کھڑکی کے پاس جاکر دیکھنے لگی لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا، رخصتی کا دن بھی آگیا بنو کو بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کس سے پوچھے؟ کیا کیا پوچھے؟ کہ آخر اب کیا ہونیوالا ہے؟ شام گذری رات آئی خوبرو احسان خان بنو کے پاس بیٹھے اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہے تھے بنو سے کہا "منہ میں لڈو ہے کیا؟ نہ سلام نہ کلام؟ بنو پریشان تھی ایک تو احسان کی قربت اور پھر حسین شہزادے کا انتظار۔ وہ معصومیت سے کہہ اٹھی میں سفید گھوڑے کا انتظار کر رہی ہوں نہ جانے کب آئے گا؟ سفید گھوڑا احسان خان حیران ہوگئے۔ جی ہاں اماں کہتی تھیں کہ سفید گھوڑے پر ایک حسین شہزادہ آئیگا اور مجھے لیجائیگا۔ احسان خان مسکرانے لگے۔ محبت سے کہا۔ نادان میں ہی تو سفید گھوڑا ہوں۔ دیکھ کیا میں حسین نہیں ہوں۔ بنو نے کہا ہو تو سہی لیکن سفید گھوڑے پر نہیں آئے وہ تو مجھے چاند تاروں کے دیس میں لے جاتے آئے گا، احسان خان قربان ہوگئے کہا، ہاں میں تمہیں چاند تاروں کے دیس ہی لے جاؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور اس طرح بنو کی زندگی کا نیا دور شروع ہوگیا دن گذرنے لگے بنو نے بیوی کے فرائض کے علاوہ ماں کے بھی فرائض بہ حُسنِ خوبی ادا کئے آخر عمر کی وہ حد بھی

آگئی جہاں فرائض کی تکمیل کے بعد انسان پھر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے اور بنو نے یہ سب دن سفید گھوڑے کے تصور میں ہی گذارے اس کے ٹاپوں کی آواز نے ہر غم و خوشی میں اس کا ساتھ دیا اسے حوصلہ دیا روایتی رشتوں کے زہریلے گھونٹ بھی اس نے مزے لے لے کر پیئے کہ اب سفید گھوڑا آتا ہی ہوگا، بس اب آتا ہی ہوگا۔ احسان خاں بنو کے پرستار تھے اس کی معصومیت اور شوخیوں پر فدا تھے اب کچھ کٹے کٹے سے رہنے لگے تھے خاندان والے ان کا ناک میں دم کر رہے تھے کہ وہ ایک اور شادی کریں بلا عذر شرعی احسان خاں کی ہمت نہ ہوتی تھی وہ خود کو مجرم بھی سمجھتے تھے کیوں کہ ہزار کوششوں کے باوجود بنو سفید گھوڑا نہ بھول سکی تھی وہ جب بھی رنجیدہ ہوتی سفید گھوڑا دوڑنے لگتا قریب ہی کہیں ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی لیکن نظر نہیں آتا۔

مرد کی ذات سے وفا بہت کم ہوتی ہے احسان خاں خاندان کی "بی جمالو" جیسی ہستیوں کے درمیان الجھ گئے تھے دوسری شادی کا تو حوصلہ نہ تھا لیکن مشورہ دینے والوں کو خاموش رہ کر بڑھاوا دیتے رہے یہی وہ مقام ہے جہاں مرد ہمیشہ مجبور ہوتا ہے۔ انھیں فکر نہ تھی کہ ان کی شریک حیات، حیات سے دور جا رہی ہے بنو نے اپنے آپ کو بہلانے کے لئے شعر و شاعری میں دل لگا لیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی بنو فکر مند رہنے لگی بچوں کی فکر، بچیوں کی فکر اسے موت کا ڈر بالکل نہ تھا وہ کئی بار موت کے منہ سے بچ نکلی تھی وہ موت کو فریب دے کر جیتی رہی تھی زندگی سے اُسے جنوں کی حد تک محبت تھی کیوں کہ زندگی کی سب سے بڑی آرزو "سفید گھوڑا" جو چاند ستاروں کے دیس سے اس کیلئے

آنے والا تھا اس پر وہ حسین شہزادہ جس کا چہرہ بنو کے تصور نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا پوری نہیں ہوئی تھی آج اس کی سالگرہ کا دن تھا جو صرف اسے ہی یاد تھا اس کی اماں اور آپا ہمیشہ جشن مناتے تھے وہ جھوم جھوم کر گاتی تھی ۔

من ڈولے میرا تن ڈولے ۔۔۔۔۔

اور آج تو من کچھ زیادہ ہی ڈولنے لگا تھا اختلاج قلب سے گھبرا کر وہ شیشے لگی بالکنی میں پڑے ایک اسٹول پر جا بیٹھی کھڑکی سے سر ٹیک کر خیالوں میں گم ہو گئی گھوڑے کی ٹاپیں اور دل کی دھڑکنیں سُر تال کی طرح میل کھانے لگیں۔ دوپہر سے شام ہوئی امی امی آپ کب سے نظر نہیں آئیں ؟ بچوں نے ماں کے اطراف گھیرا بنا ڈالا سب سے چھوٹی لڑکی نے ماں کا چہرہ چھو کر اپنے سامنے کرنا چاہا تو بنو کا سارا وجود بچوں پر آگرا، شور اٹھا، سب لوگ بھاگے بھاگے آئے احسان خاں چونک پڑے بنو سفید گھوڑے پر سوار چاند تاروں کے دیس جا چکی تھی احسان خاں مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑے کے کھڑے رہ گئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

خدارا اب یہ نہ پوچھئے گا کہ "بنو" کون تھی ؟

"ندیم"

نسرین پوری توجہ کے ساتھ گلِ بکاؤلی کے غنچوں پر پائپ سے پانی فوارے کی شکل میں ڈالتی جارہی تھی جس سے آس پاس کے جھاڑ بھی دُھلتے جارہے تھے "گلِ چاندنی" کی بیل پھولوں سے لدی ہوئی تھی، شام ہونے کے انتظار میں بس کلیاں کھِلنے ہی کو تھیں، مٹی کی خوشبو اور پھولوں کی خوشبو سے فضا خوشگوار محسوس ہو رہی تھی نسرین آگے بڑھی دالان میں چڑھنے کی سیڑھیوں کے پاس ایک دیسی گلاب کی بیل تھی جو وہ ایک دفعہ پکنک کے دوران کسی ڈاک بنگلے سے اکھاڑ کر لے آئی تھی اسی گلاب کی بیل نے نسرین کے خواب سچ بھی پورے کئے تھے۔ بے شمار گلابی رنگ کے گلاب جھکے ہوئے، کھِلے ہوئے تھے نسرین کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی اس کے لگائے ہوئے پودوں پر جب پھول کھِلتے وہ باغ باغ ہو جاتی کبھی کسی طرح کے بیج بوتی اور وہ زمین کے تہہ خانوں سے باہر سر نکالتے تو نسرین چلا اٹھتی " ابا جان! دیکھئے تو ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ابا جان مسکرا دیتے، ایک اکلوتی دس سالہ نسرین جب خوش ہوتی تو ننھے بچوں کی طرح اچھل کود مچا دیتی ۔ گلِ عباس کے سدا بہار جھاڑ ہر رنگ میں اس نے لگا رکھے تھے آنگن بڑا تھا ایک طرف چنبیلی کی بیل منڈوے پر چڑھی نسرین پر سایہ کئے رہتی صحن کے ایک طرف نیم کا درخت تھا جو بالکل سیدھا تھا نسرین نے

محلے کے بچوں کو دیکھ کر اس نے سیدھے درخت پہ چڑھنا سیکھ لیا تھا اور کبھی کڑوے نیم کی میٹھی نبولیاں کھاتے کھاتے درخت پہ بیٹھی بیٹھی رہتی جب کوئی دوسری شرارت یاد آتی تو خود اتر آتی، سائیکل چلانا اسے بہت پسند تھا کبھی کبھی سیکل لے کر گھر کے باہر نکل آتی اور جب تک نہ لوٹتی جب تک دو چار کو ٹکر نہ مارتی پھر بھی کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ حسن خان کے گھر پہ کھڑکا مار کر نسرین کی شکایت کر سکے۔ نسرین کو پتنگ بازی سے بھی بڑا لگاؤ تھا بہت دور تک جب پتنگ اڑتی تو بہت خوش ہوتی اگر کسی کی پتنگ اس کی پتنگ کو کاٹ دیتی تو اس کی ڈور ہاتھ سے توڑ کر پھینک دیتی بعد میں جب مقابل آنسو بہانے لگتا تو اپنی نئی اور بڑی بڑی پتنگیں دے کر اس کو خوش بھی کر دیتی۔ نسرین کی ماں اس کی پیدائش کے بعد ہی ختم ہو چکی تھیں ابا نے پال کر بڑا کیا۔ نوکروں پہ راج کرتی رہی پڑوس میں رہنے والی خواتین نسرین سے بہت محبت کرتی تھیں بے ماں کی بچی پہ سب ہی لوگ رحم کھاتے، سب ہی لوگ شفقت سے پیش آتے اور نسرین سب کو اپنی مرضی پہ چلاتی رہتی، غلیل پڑوس کے لڑکے سے چھین کر ہمیشہ الٹی چلاتی اور ہر بار پیشانی زخمی کر لیتی خدا کا کرم تھا کہ کبھی آنکھ پہ نشانہ نہیں لگا، ایک بار ایک زخمی سفید کبوتر صحن میں کہیں سے آگرا نسرین خوشی سے مر مر گئی، ہائے کتنا پیارا ہے، ابا جان دیکھئے یہ کبوتر کتنا اچھا ہے؟ اور اس نے زخمی کبوتر کی مرہم پٹی کی، دانہ کھلایا پانی بھی پلایا کافی دیر تک چھاؤں میں رکھا، جھاڑوں کے نیچے ہرے پتوں کے بستر پہ لٹایا مگر زخم کی جلن کم ہوتے ہی وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اڑ کر دیوار پہ جا بیٹھا اور گردن گھما گھما کر نسرین کو دیکھتا غٹرغوں کرتا رہا اور پھر اڑ گیا ۔۔۔۔ نسرین رنجیدہ ہو گئی ابا جان؟ یہ کبوتر کیسے اڑ گیا کہتے ہیں کہ طوطا اڑ جاتا ہے کبوتر وفادار ہوتا ہے کہیں نہیں جاتا مگر یہ تو بے ایمانی کر گیا نسرین نے کبوتر کے لئے بچھایا ہوا بستر اور اس کی پانی کی کٹوری آبدیدہ

نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا‘ حسن خاں بولے‘ بیٹی! پرندے ہیں اپنے ٹھکانوں پر لوٹ جاتے ہیں میں تم کو کبوتر لادوں گا تم پال کر رکھنا‘ نسرین نے اداسی سے گردن ہلائی اور پڑھنے کے کمرے میں جا بیٹھی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ماسٹر صاحب نے کافی ہوم ورک دے دیا تھا کرنا بھی ضروری تھا پھر نسرین کے ہاتھ قلم کی طرف بڑھنے اور ہوم ورک یک بھرنے لگی ـــ ـ کبوتر ہی کبوتر ـــ ـ بے شمار کبوتر ـــ ـ تمام صفحوں پر کبوتر منڈلانے لگے نسرین تھک کر اٹھ گئی‘ غٹر غوں‘ غٹر غوں ـــ ـ صحن کی طرف آتے ہوئے نسرین کے کانوں میں غٹر غوں کی آوازنے ساری دنیا کی مٹھاس انڈیل دی‘ زخمی کبوتر وہی سفید کبوتر ایک اور سفید کبوتر کے ساتھ سامنے دیوار پر آبیٹھا غٹر غوں کیے جا رہا تھا دوسرا کبوتر صرف گردن گھما گھما کر نسرین کو دیکھ رہا تھا‘ ابا جان! نسرین چلائی حسن خان بیٹی کی چیخ پر گھبرا گئے ایوان خانے سے دوڑتے ہوئے نکلے کیا ہے بیٹی؟ ابا جان‘ نسرین ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی ابا جانی میرا زخمی کبوتر آگیا اور ایک کبوتر اس کے ساتھ ہے ابا جان نے دیکھا‘ اور نسرین کو ہدایت کی کہ دانہ لے آئے نسرین دانہ ڈالتی گئی‘ غٹر غوں بڑھتی گئی آخر زخمی کبوتر نے پہل کی اور دیوار سے اڑ کر صحن میں اپنے پتوں والے بستر کے پاس آگیا اس کا ساتھی کبوتر بھی اس کے ساتھ آگیا دونوں دانہ کھانے لگے پانی کی کٹوری خالی ہونے لگی نسرین کا جام تمنا بھرنے لگا‘ گلابوں کی مہک تیز ہو گئی‘ شام نکھر آئی کبوتر وہیں ایک دوسرے کے پروں میں منہ چھپائے بیٹھ گئے گل چاندنی کھل اٹھی‘ رنگ برنگے گل عباس بہار دینے لگے خادم نے آکر بتایا کہ نسرین کے ماسٹر صاحب آگئے ہیں وہ پڑھنے چلی گئی ہوم ورک یک ماسٹر صاحب دیکھتے ہی چونک پڑے نسرین! یہ کیا ہے؟ کیا یہ ڈرائنگ کاپی ہے؟ نسرین کی آنکھوں میں کبوتر اڑنے لگے اس نے بڑی اچھی تصویریں بنائی تھیں کبوتر کہیں بیٹھے

آنے والا تھا اس پر وہ حسین شہزادہ جس کا چہرہ بنو کے تصور نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا پوری نہیں ہوئی تھی آج اس کی سالگرہ کا دن تھا جو صرف اسے ہی یاد تھا اس کی اماں اور ابا ہمیشہ جشن مناتے تھے وہ جھوم جھوم کر ناچتی تھی ے

من ڈولے میرا تن ڈولے ....

اور آج تو من کچھ زیادہ ہی ڈولنے لگا تھا اختلاج قلب سے گھبرا کر وہ شیشے لگی بالکنی میں پڑے ایک اسٹول پر جا بیٹھی کھڑکی سے سر ٹیک کر خیالوں میں گم ہو گئی گھوڑے کی ٹاپیں اور دل کی دھڑکنیں سُر تال کی طرح میل کھانے لگیں۔ دوپہر سے شام ہوئی امّی امّی آپ کب سے نظر نہیں آئیں ؟ بچوں نے ماں کے اطراف گھیرا بنا ڈالا سب سے چھوٹی لڑکی نے ماں کا چہرہ چھو کر اپنے سامنے کرنا چاہا تو بنو کا سارا وجود بچوں پر آ گرا۔ شور اٹھا، سب لوگ بھاگے بھاگے آئے احسان خاں چونک پڑے بنو سفید گھوڑے پر سوار چاند تاروں کے دیس جا چکی تھی احسان خاں مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑے کے کھڑے رہ گئے ....!

خدارا اب یہ نہ پوچھئے گا کہ "بنو" کون تھی ؟

"ندیم"

نسرین پوری توجہ کے ساتھ گلِ بکاؤلی کے غنچوں پر پائپ سے پانی فوارے کی شکل میں ڈالتی جارہی تھی جس سے آس پاس کے جھاڑ بھی دُھلتے جارہے تھے "گلِ چاندنی" کی بیل پھولوں سے لدی ہوئی تھی، شام ہونے کے انتظار میں بس کلیاں کھلنے ہی کو تھیں۔ مٹی کی خوشبو اور پھولوں کی خوشبو سے فضا خوشگوار محسوس ہورہی تھی نسرین آگے بڑھی دالان میں چڑھنے کی سیڑھیوں کے پاس ایک دیسی گلاب کی بیل تھی جو وہ ایک دفعہ پکنک کے دوران کسی ڈاک بنگلے سے اکھاڑ کر لے آئی تھی اسی گلاب کی بیل نے نسرین کے خواب بچپن پورے کئے تھے۔ بے شمار گلابی رنگ کے گلاب مہکے ہوئے، کھلے ہوئے تھے نسرین کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی اس کے لگائے ہوئے پودوں پر جب پھول کھلتے وہ باغ باغ ہوجاتی کبھی کسی طرح کے بیج بوتی اور وہ زمین کے تہہ خانوں سے باہر سر نکالتے تو نسرین چلا اٹھتی " ابا جان! دیکھئے تو ۔۔۔۔۔۔۔ اور ابا جان مسکرا دیتے، ایک اکلوتی دس سالہ نسرین جب خوش ہوتی تو ننھے بچوں کی طرح اچھل کود مچا دیتی۔ گلِ عباس کے سدا بہار جھاڑ ہر رنگ میں اس نے لگا رکھے تھے آنگن بڑا تھا ایک طرف چنبیلی کی بیل منڈوے پر چڑھی نسرین پر سایہ کئے رہتی صحن کے ایک طرف نیم کا درخت تھا جو بالکل سیدھا تھا نسرین نے

محلے کے بچوں کو دیکھ کر اس نے سیدھے درخت پر چڑھنا سیکھ لیا تھا اور کبھی کڑوے نیم کی میٹھی نبولیاں کھاتے کھاتے درخت پر بڑی دیر بیٹھی رہتی جب کوئی دوسری شرارت یاد آتی تو خود اتر آتی، سائیکل چلانا اسے بہت پسند تھا کبھی کبھی سیکل لے کر گھر کے باہر نکل آتی اور جب تک نہ لوٹتی جب تک دو چار کو ٹکر نہ مارتی پھر بھی کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ حسن خان کے گھر یہ گھڑ کا دار کر نسرین کی شکایت کر سکے۔ نسرین کو پتنگ بازی سے بھی بڑا لگاؤ تھا بہت دور تک جب پتنگ اڑتی تو بہت خوش ہوتی اگر کسی کی پتنگ اس کی پتنگ کو کاٹ دیتی تو اس کی ڈور ہاتھ سے توڑ کر پھینک دیتی بعد میں جب مقابل آنسو بہانے لگتا تو اپنی نئی اور بڑی بڑی پتنگیں دے کر اس کو خوش بھی کر دیتی۔ نسرین کی ماں اس کی پیدائش کے بعد ہی ختم ہو چکی تھیں ابا نے پال کر بڑا کیا۔ نوکروں پر راج کرتی رہی پڑوس میں رہنے والی خواتین نسرین سے بہت محبت کرتی تھیں بے ماں کی بچی پر سب ہی لوگ رحم کھاتے، سب ہی لوگ شفقت سے پیش آتے اور نسرین سب کو اپنی مرضی پر چلاتی رہتی، غلیل پڑوس کے لڑکے سے چھین کر ہمیشہ الٹی چلاتی اور ہر بار پیشانی زخمی کر لیتی خدا کا کرم تھا کہ کبھی آنکھ پر نشانہ نہیں لگا، ایک بار ایک زخمی سفید کبوتر صحن میں کہیں سے آ گرا نسرین خوشی سے مر مر گئی، ہائے کتنا پیارا ہے، ابا جان دیکھئے یہ کبوتر کتنا اچھا ہے؟ اور اس نے زخمی کبوتر کی مرہم پٹی کی، دانہ کھلایا پانی بھی پلایا کافی دیر تک چھاؤں میں رکھا، جھاڑوں کے نیچے ہرے پتوں کے بستر پر لٹایا مگر زخم کی جلن کم ہوتے ہی وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اڑ کر دیوار پر جا بیٹھا اور گردن گھما گھما کر نسرین کو دیکھتا غٹر غوں کرتا رہا اور پھر اڑ گیا ----- نسرین رنجیدہ ہو گئی ابا جان؟ یہ کبوتر کیسے اڑ گیا کہتے ہیں کہ طوطا اڑ جاتا ہے کبوتر وفادار ہوتا ہے کہیں نہیں جاتا مگر یہ تو بے ایمانی کر گیا نسرین نے کبوتر کے لئے بچھایا ہوا بستر اور اس کی پانی کی کٹوری آبدیدہ

نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، حسن خاں بولے، بیٹی! پرندے ہیں اپنے ٹھکانوں پر لوٹ جاتے ہیں میں تم کو کبوتر لادوں گا تم پال کر رکھنا، نسرین نے اداسی سے گردن ہلائی اور پڑھنے کے کمرے میں جا بیٹھی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ماسٹر صاحب نے کافی ہوم ورک دے دیا تھا کرنا بھی ضروری تھا پھر نسرین کے ہاتھ قلم کی طرف بڑھے اور ہوم ورک بک بھرنے لگی ــ ــ ــ کبوتر ہی کبوتر ــ ــ ــ بے شمار کبوتر ــ ــ ــ تمام صفحوں پر کبوتر منڈلانے لگے نسرین تھک کر اٹھ گئی، غٹرغوں، غٹرغوں ــ ــ ــ صحن کی طرف آتے ہوئے نسرین کے کانوں میں غٹرغوں کی آواز نے ساری دنیا کی مٹھاس انڈیل دی، زخمی کبوتر وہی سفید کبوتر ایک اور سفید کبوتر کے ساتھ سامنے دیوار پر آبیٹھا غٹرغوں کیے جا رہا تھا دوسرا کبوتر صرف گردن گھما گھما کر نسرین کو دیکھ رہا تھا، اباجان! نسرین چلائی حسن خان بیٹی کی چیخ پر گھبرا گئے دیوان خانے سے دوڑتے ہوئے نکلے کیا ہے بیٹی؟ اباجان، نسرین ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی ابا جانی میرا زخمی کبوتر آگیا اور ایک کبوتر اس کے ساتھ ہے اباجان نے دیکھا، اور نسرین کو ہدایت کی کہ دانہ لے آئے نسرین دانہ ڈالتی گئی، غٹرغوں بڑھتی گئی آخر زخمی کبوتر نے پہل کی اور دیوار سے اڑ کر صحن میں لیپنے پتوں والے بستر کے پاس آگیا اس کا ساتھی کبوتر بھی اس کے ساتھ آگیا دونوں دانہ کھانے لگے پانی کا کٹوری خالی ہونے لگی نسرین کا جام تمنا بھرنے لگا، گلابوں کی مہک تیز ہوگئی، شام نکھر آئی کبوتر دہیں ایک دوسرے کے پروں میں منہ چھپائے بیٹھ گئے گل چاندنی کھل اٹھی، رنگ برنگے گل عباس بہار دینے لگے خادمہ نے آکر بتایا کہ نسرین کے ماسٹر صاحب آگئے ہیں وہ پڑھنے چلی گئی ہوم ورک بک ماسٹر صاحب دیکھتے ہی چونک پڑے نسرین! یہ کیا ہے؟ کیا یہ ڈرائنگ بک ہے؟ نسرین کی آنکھوں میں کبوتر اڑنے لگے اس نے بڑی اچھی تصویریں بنائی تھیں کبوتر کہیں بیٹھے

تھے کہیں اڑ رہے تھے لیکن تھے تو کبوتر ہی۔۔۔۔۔

دوسرے دن کے لئے دوہرا ہوم ورک پڑھائی کے بعد لے کر جب ۔۔۔ وہ اندر آگئی کبوتر ایک دوسرے کے پروں میں منہ چھپائے سو چکے تھے۔ نسرین کو آج کیسے نیند آتی خوشی کی زیادتی سے بھی انسان بے چین رہتا ہے نہ بھوک نہ پیاس نہ نیند، نسرین کسی طرح صبح کے انتظار میں آخر سو ہی گئی۔ صبح صبح غٹرغوں سے آنکھ کھلی اٹھتے ہی پہلے اس نے دیکھا کہ کبوتر بے خوف دالان میں چلے آئے ہیں اور غٹر غٹر رہے ہیں اس نے دانہ ڈالا، پانی رکھا اور آنگن میں منڈیر پر بیٹھ گئی۔ دن آگے بڑھتے لگا کوئی دستک دے رہا تھا معلوم ہوا کہ ندیم آئے ہیں ۔۔ ندیم، حسن خاں کے مرحوم دوست کا لڑکا تھا بے حد حسین و جمیل بہت ہی مالدار گھرانے کا شریف النفس خاندان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ نسرین کا طلبگار تھا ندیم کی صرف والدہ تھیں اور کوئی نہیں تھا بمبئی میں جواہرات کا کاروبار تھا جواہرات کے کاروبار نے اتنا تو ندیم کو سکھا دیا تھا کہ ہیرے کی آب وتاب سے قیمت کا اندازہ کر لیتا۔ نسرین سے شادی کی بات اس کی والدہ اور حسن خاں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ ہو رہی تھی حسن خاں اپنے برابر کے اس خاندان میں بیٹی دینا تو چاہتے تھے مگر نسرین کی مرضی کے بغیر نہیں۔ ندیم کو یقین تھا کہ نسرین انکار نہیں کرے گی۔ حسن خاں نے ندیم کی والدہ کو لکھ دیا تھا کہ وہ ابھی دو تین سال سے پہلے شادی نہیں کریں گے نسرین کی عمر ابھی شادی کی نہیں ہے ندیم کی ماں انتظار پر راضی ہو گئی مگر انھوں نے باپ بیٹی کو بھی دعوت دے کر بلایا اور چند قریبی دوستوں کی موجودگی میں نسرین کو زریں کام والا ڈوپٹہ اوڑھا اور ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی ہیرے کی شعاعیں نسرین کے چہرے تک پہنچ رہی تھیں پھر کھانے کے بعد سب لوگ واپس ہو گئے۔

حسن خان جیسے ہی حیدرآباد واپس ہوئے نسرین دوڑتے ہوئے کبوتروں کے پاس آئی کبوتر موجود تھے خادمہ برابر دانہ ڈال رہی تھی نسرین کو دیکھتے ہی زخمی کبوتر نسرین کے کاندھے پر آبیٹھا اور دوسرا کبوتر نسرین کے گرد چکر کاٹتا اور غٹرغوں کرتا رہا پھر نسرین پڑوس والی خالا جان کے پاس جا پہنچی خالا جان نے ڈانٹا یہ بال کھلے رکھے کیوں بھاگتی پھر رہی ہو؟ لاؤ میں چوٹیاں ڈال دوں مگر نسرین نے لہرا کر گول پھرنا شروع کر دیا کھلے بال اور گھیر دار فراک نسرین کے تابعدار تھے، خالہ جان نے دیکھا کہ اس کے گول پھرنے کے ساتھ ساتھ نسرین کے چہرے پہ کچھ کرنیں بھی نظر آرہی ہیں، ہائیں! یہ کیا خالہ جان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر ذرا قدم ڈگمگائے تو نسرین رک گئی ہاتھوں میں ڈوپٹہ کا گولہ سا بنا کر نانی ماں (خالہ جان کی ماں) کی طرف اچھال دیا بڑی بی نے بڑے پیار سے اسے گلے لگا لیا سینے پہ ہاتھ رکھے نسرین اپنی سانسیں درست کرنے لگی تو کرنیں ستونوں اور دالان کی دیواروں پہ لرزتی دکھائی دیں ارے یہ نئی انگوٹھی تم کو حسن بھائی نے کیا بمبئی سے لا کر دی ہے؟ خالہ جان پوچھ بیٹھی دراصل وہ کرنیں نہیں تھیں ہیرے کی انگوٹھی کی شعاعیں تھیں نسرین نے دامن سے پسینہ پوچھتے ہوئے کہا نہیں یہ تو وہاں ایک اور خالہ جان تھیں بمبئی والی خوب صورت خالہ جان انھوں نے پہنائی ہے اور ایک چمکتا ہوا، ڈوپٹہ بھی مجھے اڑھایا ہے میں لے آؤں آپ دیکھئے۔ نسرین دوڑی دوڑی گھر واپس آئی کبوتروں کی جانب دیکھا نہیں تھا۔ شائد کہیں تفریح کے لئے گئے تھے نسرین نے دل میں سوچا اور زر کا کامدار ڈوپٹہ کھلے بالوں کے سر پہ دلہن کی طرح ڈالے ہوئے نسرین پھر پڑوس میں چل دی خالہ جان نے دیکھا، یا اللہ، اس بے ماں کی بچی کو نظرِ بد سے بچائیو، خالہ جان خلوصِ دل سے دُعا دے رہی تھیں نانی ماں نے نظر کی دُعا پڑھی اور کچھ مرچیں اور نمک لے کر چولہے میں جھونک ڈالا چٹاخ پٹاخ ہوتی رہی، نظر اتر گئی خالہ جان ڈوپٹہ اور انگوٹھی دیکھ کر

خوش ہوئیں اپنی ماں سے کہا امی دیکھئے تو میں ابھی حسن بھائی سے جاکر لڑوں گی بیٹی کی منگنی کردی اور ہم کو خبر نہ ہونے دی نہ مٹھائی نہ دکھائی یہ کوئی بات ہے آخر کو داماد آرہا ہے ہمارا بھی تو وہ داماد ہوا نا' میں ابھی جاتی ہوں کہہ کر خالہ جان نسرین کو لے کر حسن خاں کے گھر پہنچیں حسن بھائی یہ کیا ہے آپ نے نسرین کی منگنی کردی اور ہمیں اطلاع نہیں کی کیا ہم اتنے غیر ہوگئے ؟ بیس برس کے اس رشتے کی آپ نے یوں لاج رکھی ؟ خالہ جان لڑنے پہ آمادہ تھیں ۔ حسن خاں مسکرائے اور کہا نہیں نہیں (اتفاق سے ایسا ہوا مجھے خود خبر نہیں تھی کہ وہ لوگ انگوٹھی پہنائیں گے آپ لوگوں کے بغیر نسرین کا کوئی کام بھلا ہوسکتا ہے ؟

بات ختم ہوگئی نسرین حیران تھی کہ " منگنی " کیا ہے ؟ کیا کوئی چیز مانگنے کو " منگنی " کہتے ہیں یا میرا نام ہی " منگنی " رکھا گیا ہے " نسرین منگنی " دل ہی دل میں نسرین ہنس پڑی اونہہ ----- خدا جانے کیا ہے منگنی -----

ایک ہفتہ بعد ندیم بمبئی سے پھر حیدرآباد آگیا نسرین اُسے بے انتہا پسند تھی کاروبار کا بہانہ کرکے وہ بار بار حسن خاں کے گھر آتا رہتا اب بھی وہ سیدھا صحن میں وہیں آگیا جہاں نسرین جھاڑوں میں پانی ڈال رہی تھی اور کبوتروں میں مگن تھی ندیم نے کہا " آداب عرض ہے " ندیم کو شاعری سوجھی تھی ۔ " آداب " نسرین نے بے دلی سے جواب دیا اور پھر اپنے دلچسپ کام میں مصروف ہوگئی نسرین ! تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں ؟ ندیم نے پوچھا' نسرین بولی کیا بات کروں ؟ یہی ----- یہی کچھ بھی --- یعنی کہ کوئی بھی بات ! ندیم گڑبڑا گیا ۔ نسرین خاموشی سے مٹی پہ بے تکلف بیٹھ گئی اور گل عباس کے پھول کا گجرا بنانے لگی ندیم نے پوچھا یہ گجرا بناکر کیا تم مجھے پہناؤ گی ؟ نہیں ! میں اپنے سر میں لگاؤں گی ' نسرین سادگی سے بولی' لیکن سر میں کیسے لگاؤ گی تمہارے بال تو کھلے ہوئے ہیں اور اتنے سارے ہیں' اتنے سارے

پھول آئیں گے کہاں سے ؟ ندیم کو شرارت سوجھی تھی نسرین بول پڑی پھول اگر کم ہو جائیں تو میں بال کم کروالوں گی بازو والی خالہ جان سے ۔۔۔۔۔۔

بائیس سالہ ندیم کو یہ بھولا پن ہی پسند تھا اب ہمت کر کے پوچھ بیٹھا نسرین یہ انگوٹھی پسند آئی تمہیں ؟ ہاں اچھی ہے نسرین سنجیدہ سی تھی ۔ تو پھر تم میری دلہن بنو گی نا؟ نسرین چپ تھی وہ " منگنی " کے معنی پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھنے میں پس و پیش تھا نہ جانے کیوں ؟ وہ کبوتروں کو کھلاتی جا رہی تھی کچھ جواب دیئے بغیر ندیم نے مسلسل اس کی توجہ کبوتروں کی طرف دیکھی تو بول پڑا نسرین ! جواب دو نسرین خواہ مخواہ خاموش تھی ۔ ندیم کو غصہ آ گیا اس نے کبوتروں پر ایک جھپٹا مارا کہ وہ گھبرا کر اڑ گئے ، نسرین آگ بن گئی اور ندیم کے منہ پہ ہیرے کی انگوٹھی اتار کر دے ماری اور کہا میں نہیں بنوں گی تمہاری دلہن تم نے میرے کبوتر اڑا دیئے میں تمہاری دلہن کبھی نہیں بنوں گی ۔ اور چلا چلا کر رونے لگی ، حسن خان گھبرا کر آئے تو یہ حال دیکھا اباجان ! میں ندیم کی دلہن نہیں بنوں گی اباجان میں کنویں میں کود جاوں گی اس نے کنویں کی طرف اشارہ کیا جہاں چھوٹی سی منڈیر برائے نام بنی ہوئی تھی حسن خاں دہل گئے ندیم ! میں اپنی بیٹی کی شادی اس کی پسند کے بغیر نہیں کروں گا ندیم کی آنکھیں چھلک پڑیں ندیم زار و قطار رونے لگا عورتوں کی طرح ۔۔۔۔۔ ۔۔۔ حسن خاں نے اسے گلے لگایا سمجھایا کہ وہ بیٹے کی طرح اسے چاہتے ہیں ، چاہتے رہیں گے لیکن شادی نسرین کی پسند سے ہی ہوگی ۔ نسرین نے اپنے ابا کو بڑے غرور سے دیکھا اس نے گردن گھما کر ندیم کی طرف دیکھا جہاں آنسوؤں کی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی نسرین کے آنسو تھم گئے ندیم کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے ۔ کبوتر نہ جانے کہاں اڑ گئے پھر دوبارہ نہیں آئے ۔ غمزدہ نسرین سوچ رہی تھی کہ ندیم کی بد دعائیں اس کے ساتھ ابھی تک چل رہی ہیں وہ ندیم کی بد دعاوں

کے بگولوں کی زد میں آگئی ہے وہ آنسو جو ندیم نے اس کے لئے برسائے تھے وہ آنسو اب نسرین کا مقدر تھے، شوہر، بچے، دولت، عزت سب کچھ ہے مگر وہ قرار نہیں جو اُسے ملنا چاہیئے تھا سکون کے وہ لمحے نہیں جن میں زخمی کبوتروں کا علاج ہو سکتا تھا، جہاں گلاب کے تازہ پھولوں کی مہک ہوتی تھی، جہاں گلِ عباس کے پھولوں کے گجرے بنائے جاتے تھے جہاں گلِ بکاؤلی کے غنچوں کو پانی سے دھو دھو کر اجلا کیا جاتا تھا جہاں گلِ چاندنی کے پھول ٹھنڈک کا احساس دلاتے تھے جہاں نیم کے درخت کے میٹھے پھل زندگی میں رس گھولتے تھے رقص کرتے ہوئے پیکر کے وہ کھلے ہوئے بڑے بڑے بالوں کا سایا کبھی نہیں ــــ نہ جانے ندیم کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ کاش کبھی مل جائے تو کم سے کم معافی تو مانگ لوں نسرین دل ہی دل میں روتی رہی خیالوں میں گم رات بالکنی میں بیٹھ کر گذارتے ہوئے نسرین نے آسمان کی طرف دیکھا تارے مدھم ہو رہے تھے لیکن وہ تارا اب بھی روشن تھا جو شام کو جلدی نکلتا ہے اور صبح کو دیر سے ڈوبتا ہے مسافر سمت کا تعین کرتے ہیں اور اپنے راستوں پر چل پڑتے ہیں لیکن نسرین جہاں سے چلتی پھر وہیں آجاتی کوئی اور راستہ نہیں ملتا نہ آگے نہ پیچھے، ہنستے ہوئے زندگی کے شب و روز میں چلتی اور غموں کے اس سرے پر واپس آجاتی جہاں سے وہ چلی تھی ایسے مسافر ہمیشہ تنہا رہتے ہیں بالکل اس ستارے کی طرح جو شام کو جلدی نکلتا ہے اور صبح دیر سے ڈوبتا ہے ــ ــ ــ ــ

انتقام

جیل بھیج دیئے جانے والے قیدیوں کے ذہن میں جب جیل سے بھاگ جانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو ایک ہی جھٹکے میں پاؤں اور ہاتھوں تک کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں، قیدخانے کی فلک بوس دیواروں کے لیے ایک ہی چھلانگ کافی ہوتی ہے اور ایسا ہی کچھ ذکیہ نے بھی کر ڈالا تھا رشتوں کی زنجیریں اور سماج کی دیواریں پھلانگ کر وہ نادر کے ساتھ ملک کے اس کونے میں جا بسی تھی جہاں لوگ اونچی بلڈنگوں میں ہی نہیں، موریوں کی پائپ لائن میں بھی بسیرا کر لیتے ہیں ذکیہ نہ صرف اپنے ساتھ سارے زیور لے آئی تھی بلکہ دونوں بیٹیوں کے نام سے رکھی گئی وہ رقم بھی لے آئی تھی جوان کی شادی کے لیے تھی، شوہر کی معزز گھرانے سے وابستگی بھی ذرا دیر اس رتعاش سے بچ نہ سکی.......... ذکیہ بھاگ گئی، مظہر خان کی بیوی بھاگ گئی، افسر خان کی بہو بھاگ گئی......... غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

بمبئی کی راتیں، کلبوں اور دولت مندوں کے گھر میں تابانیوں کے ساتھ رقصاں بنتی ہیں لیکن اس رات کا انداز غریبوں کی بستیوں میں بدلا ہوا رہتا ہے۔ ہمیشہ ماتمی سیاہ چادر اوڑھے شرم سے سر جھکائے غربت کی ناتوانیوں پر اشک بہاتی رہتی ہے

ذکیہ نے ایسی ہی شب کے دامن میں پناہ لی تھی وہ سنجیدہ مزاج شوہر کے حصار سے نکل کر نادر کے دکھائے ہوئے پرائے خوابوں کے تانے بانے میں الجھ گئی تھی جو سنہری تو تھے مگر قیمتی نہیں۔

رفتہ رفتہ زیورات اور رقم ختم ہونے کے بعد حالات اس "پرنالہ" کی طرح ہو گئے جو بارش سے بہتے بہتے رکنے لگتا ہے، پھر قطرہ قطرہ ٹپکنے کے بعد خشک ہو جاتا ہے جہاں سے ایک بوند بھی نہیں گرتی.......

ذکیہ نے شاندار زندگی گھر کے ادنی ملازم کے لئے ٹھکرا دی تھی معمولی سا ڈرائیور جو اس کے شوق ذوق کا لحاظ رکھتا تھا، شوہر کی اوسط درجہ کی زندگی میں ضرورتیں بہتر طریقے پر پوری ہو ہی جاتیں لیکن خواہشیں ہمیشہ ادھوری رہتیں دونوں بیٹیوں کی شادی کے لئے مظہر جان خون پسینہ ایک کر کے رقم جمع کرتے رہے انھیں یہ خبر نہ ہو سکی کہ ذکیہ خواہشوں کے بھنور میں پھنس گئی ہے، پڑوس کی عورتوں کے زیور ہر ماہ بدلتے تھے لیکن ذکیہ کو وہی پرانے زیورات پر اکتفا کرنا پڑتا تھا، انھیں پرانی ساڑیوں کو پہننا پڑتا تھا جو اس کی پڑوسنوں کو بالکل پسند نہیں تھیں، ہوٹلوں میں کھانے، سکنڈ شو، اور کلب کی حسرت، دل میں ہی گھٹتی رہتی کبھی کسی کام سے جانا ہوتا تو وہ اپنی کار میں اکیلی ڈرائیور کے ساتھ چل جاتی کئی بار نادر نے ذکیہ کو بتایا کہ فلاں ہوٹل میں کھانا اچھا ملتا ہے۔ فلاں فلم بہت اچھی ہے وغیرہ وغیرہ اور ذکیہ آہ کر کے رہ جاتی، ایک بار نادر نے ذکیہ کو اصرار کر کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھلایا اور کہا "میڈم! کبھی آپ بھی "ان جوائے" کیجئے مظہر صاحب تو مرد ہیں آفس کے کام کے بہانے عیش کر لیتے ہیں" (حالاں کہ ایسا نہیں تھا)

ذکیہ نادر کی طرف جھکنے لگی رفتہ رفتہ بات اور بھی آگے بڑھی ---- اور پھر یہ واقعہ ہوگیا۔ جب ساتھ لائے ہوئے سرمائے نے ساتھ چھوڑ دیا تو نادر نوکری ڈھونڈھنے نکلا کسی جگہ بڑی مشکل سے نوکری ملی لیکن اس میں پیٹ بھرنا بھی مشکل تھا بھلا خواہشوں کا ذکر ہی کیا؟ ذکیہ چڑچڑی رہنے لگی "نادر! آخر یہ تکلیف کب ختم ہوگی؟ نادر نے کہا بس اب تکلیف کے دن ختم ہونے ہی والے ہیں......

ایک دن رات کو ٹین کے اس سائبان کے نیچے جہاں ذکیہ سو رہی تھی دو سائے نظر آئے انھوں نے سوتی ہوئی ذکیہ کے منہ پر رومال رکھا اور بے ہوش کرکے اس کار میں لے گئے جس میں یہ لوگ آئے تھے۔ خوب صورت ذکیہ کا سودا کرکے نادر نے کافی رقم کمائی تھی، اور کچھ نوکری سے بھی یعنی ایک فلمی اداکار کا ڈرائیور ہونا معمولی بات نہیں تھی نادر نے ہر طرح روپیہ کمایا اور خوب کمایا اب وہ نادر سیٹھ کے نام سے مشہور ہوگیا، عیش و آرام کی ہر چیز کا وہ مالک تھا ذکیہ اس کے ذہن سے نکل چکی تھی نہ جانے اس کا کیا حال ہوا ہو نادر کی نادر شاہی کی شہرت ملک کے باہر بھی پہنچنے لگی اس نے ایک بہت ہی حسین مالدار بیوہ سے شادی کرکے شرافت کا مڈل بھی حاصل کرلیا تھا۔ ایک دن خلیج سے ایک عرب سوداگر اپنی پارٹی کے ساتھ آیا نادر سے کچھ معاملہ کرنا تھا معاملہ طئے ہوگیا عرب سوداگر کی خاطر کا نادر نے بہترین انتظام کروایا تھا" رات جگمگا رہی تھی چہرے پر نقاب ڈالے حسین رقاصہ رقص کرتے ہوئے بار بار عرب مہمان کو جام دیتی جا رہی تھی اور صراحی نادر سیٹھ کے ہاتھ میں تھی آخر وہ صراحی رقاصہ نے ایک ادا کے ساتھ نادر سیٹھ سے چھین لی اور رقص کرتی رہی ذرا دیر کے لئے لائٹ آف ہوئی اور پھر روشنی ہوگئی صراحی رقاصہ نے پھر نادر سیٹھ

کے ہاتھ میں دے دی اب نادر سیٹھ عرب مہمان کی تواضع میں لگ گیا.......... پہلے جام پر ہی مہمان لڑکھڑا کر گر پڑا۔ رقص تھم گیا، ساز رک گئے شور مچ گیا نادر سیٹھ نے ڈاکٹر بلوایا ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ یہ تو ختم ہو چکے انھیں زہر دیا گیا ہے مہمان کے نیلے ہونٹ اس بات کے شاہد تھے ذرا دیر میں پولیس آئی نادر سیٹھ کے ہاتھ میں صراحی سے قتل کی شہادت ثابت ہو گئی نادر سیٹھ کے لئے سزائے موت طے پائی اور قید خانے میں مختصر مدت کے لئے اسے ڈال دیا گیا۔

ملاقات کا وقت تھا ذکیہ چادر میں لپٹی سلاخوں کے پاس نادر سے کہہ رہی تھی نادر! تم نے مجھے باعزت زندگی کی قید سے آزاد کیا تھا نا؟ دیکھو تمہارا عرصۂ حیات کتنا تنگ ہو گیا؟ تم نے عورت کو کھلونا سمجھا تھا اس کے دوسرے رُخ سے واقف نہ تھے، وہ رقاصہ جس میں تمہارے ہاتھ سے صراحی لے کر شراب میں زہر ملایا وہ کوئی اور نہیں میں تھی، میں —! تم نے بردوں کے ہاتھوں ذرا سی رقم کے بدلے مجھے بیچ ڈالا تھا، میں منظر خاں کی بیوی با ہوش و حواس اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے قتل کیا ہے تمہیں سزا دلوانے کے لئے........

ذکیہ نے نادر سے انتقام لے لیا تھا ذکیہ چلانے لگی ہنسنے لگی قید خانے کے عملے نے آ کر ذکیہ کو گرفتار کر لیا وہ دماغی توازن کھو چکی تھی........ منظر خان کی بددعاؤں نے ذکیہ سے انتقام لے لیا تھا........

چنگاری

گھر میں کافی عورتیں جمع تھیں آج شبانہ کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی گھر میں ایک معقول تقریب منعقد ہونے جارہی تھی باورچی اپنے مورچہ پر ڈٹے ہوئے تھے اور کچھ لڑکے، لڑکیاں اسٹیج سجاتے سجاتے لڑ بھی رہے تھے بہرحال کافی دھوم تھی شبانہ کی نئی ساڑھی کا بلاوز ابھی تک سل کر نہیں آیا تھا جو ان کے پڑوس میں رہنے والی ایک خاتون کو ارجنٹ سینے کے لئے دیا گیا تھا۔ سنہری زرین جارجٹ کی ساڑی اور سنہری باڈر والا۔ سلک کا بلاوز شبانہ کے خسر نے لاکر دیا تھا وہ اپنے خسر کی بہت ہی چہیتی و لاڈلی بہو تھی نا! اس لئے۔

ادھر ساس بیگم مرچیں چبائے بیٹھی تھیں بھلا گھر کی بہو وہ بھی بڑی بہو اور اس قدر بے کار کہ اپنا ایک بلاوز بھی نہیں سی سکتی ہے بھلا کتنی دیر لگتی ہے بلاوز سینے میں ہ مگر بہو بیگم کو گڑیوں سے فرصت ملے تو کچھ بات بنے وغیرہ وغیرہ......

مجاہد بڑوں کے سامنے نظر اٹھانے کو بھی بدتمیزی سمجھتے تھے ماں کی باتوں پر اعتراض ہو بھی تو اظہار کبھی نہ کرتے اور چپکے سے کھسک جاتے، اس وقت بھی یہی ہوا ماں کے حملے انھیں اچھے نہیں لگے وہ چپکے سے گھر سے باہر چلے گئے نہ جانے کونسا کام رک گیا تھا کہ اچانک مجاہد میاں کی ضرورت پیش آگئی۔ مجاہد میاں کہاں ہو؟ ماں نے پکارا "

کسی طرف سے آواز آئی وہ ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔ لے لو! یہ بھی کوئی وقت ہے بھلا جانے کا یہ تو ہوا نہیں کہ ذرا بھائیوں کی مدد کر دیتے، کسی کام میں ہاتھ بٹا دیتے باہر چل دیئے نواب صاحب۔ ماں کو چڑ سی آگئی رُخ پھر بہو کی طرف ہو گیا اب بلاوز اگر نہ مل سکا تو بہو بیگم نئی ساڑی کیسے پہنے؟ کبھی ہماری بھی شادی کم عمری میں ہی ہوئی تھی یہاں تک کہ جب بارات آئی تو میں بھی سب کے ساتھ چھت پر سے بارات دیکھ رہی تھی گھر میں گڑبڑ مچ گئی کہ دلہن غائب ہے آخر وہ چھت پر مل گئی۔ مجھے گھر کے کام کاج شادی کے فوراً بعد سونپ دیئے گئے تھے بھلا سب ساسیں کیا میری طرح ہوتی ہیں۔؟ میں لاکھ کہوں مگر شبانہ سنتی ہی نہیں سسر جی کی ہتھیلی کا چھالا ہے میاں نے بھی غلامی کی قسم کھا رکھی ہے۔ بھلا کوئی بات ہے گھر کی بڑی بہو جھاڑوں پہ چڑھتی پھرے، کام کاج ساس نندیں کریں اور یہ آرام کی کھائے خورشید بیگم ساس میٹھی بولتی جا رہی تھیں۔ غوثیہ بیگم جوان کی بڑی نند تھیں انھوں نے ٹوکا بھی بس کرو خورشید! کیا معصوم بچی کے پیچھے پڑ گئی ہو، بچی ہے، سب کچھ رفتہ رفتہ سیکھ جائے گی ابھی اس کی عمر ہی کتنی ہے چودہ سال بھی پورے نہیں ہوئے اور پھر آج خوشی کا دن ہے تم اسے سر پہ ہاتھ رکھ کر بیاہ لائی ہو کم سے کم آج تو برائی نہ کرو۔

جیسے تیسے سارے کام ہو گئے شبانہ کا بلاوز بھی سل کر آ گیا شام کو سب مہمان آ گئے طرح طرح کے تبصرے ہوتے رہے آخر شبانہ سنہری ساڑی بلاوز پہنے چھم سے آ کر مسند پہ پہلے ہی جم گئی ہر طرف ہنسی کے فوارے چھوٹ پڑے۔ شاہد صاحب نے نظر کی دعا پڑھ کر بہو پر پھونکی شبانہ انھیں بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز تھی شبانہ سے پوچھا کہ وہ کیوں پہلے آ بیٹھی؟ باداجان آج میری شادی کی سالگرہ ہے نا؟ آپ ہی نے تو کہا تھا؟ شبانہ اُلٹا سوال کر بیٹھی۔ آخر مجاہد میاں بھی سوٹ پہن کر آ گئے انھیں

بھی مسند پر شبانہ کے ساتھ بٹھا دیا گیا پھول پہنائے گئے تاج محل " جیسا کیک کاٹا گیا پھر کھانے کا دور شروع ہوا کوفتہ پلاؤ، شاہی مرغ کا سالن، بادام کی کھیر مرغ مسلّم نان شاہی غرض کہ سارا پکوان بے حد لذیذ تھا۔ بڑی بوڑھیوں کے درمیان گفتگو چھڑ گئی۔ ارے، دلہا دلہن میں محبت ہو تو ان کی ہر تقریب کا پکوان مزیدار ہوتا ہے اور خورشید بیگم تو پہلی بہو نہ جانے کتنے چراغ لے کر، ڈھونڈھ لائی ہیں " بھئی واہ، خورشید بیگم کی نظر کا جواب نہیں، ایک خاتون نے داد دی۔ خورشید بیگم جو پاس ہی بیٹھی تھیں پان بنا بنا کر مہمانوں کو بھیج رہی تھیں اترانے لگیں، ارے، میری بہو کو ڈھونڈھنے کی ضرورت ہی کیا، وہ تو آفتاب کی طرح روشن اور سامنے ہے آخر میری بڑی بہو جو ٹھہری، میرے خاندان کی ملکہ، خورشید بیگم پر گویا ممتا کا دورہ پڑا تھا۔ ادھر شبانہ زرین ساڑی پہنے عادت سے مجبور سب کے کھانے کا جائزہ لیتے ہوئے باورچیوں کے پاس پہنچی اور کہا، حاجی بابا! اب آپ لوگ کھانا کھائیے اور ہم آپ کو سپلائی کریں گے آپ لوگوں کو بھی چوکی پر ہی کھانا ہوگا، حاجی بابا دعائیں دینے لگے اور کہا، بیٹی میں بال بچوں والا ہوں توشہ دان میں میرا حصہ دے دیجئے۔ شبانہ ناراض ہو گئی نہیں۔ توشہ دان کا حصہ تو بال بچوں کے لئے ہوگا آپ یہاں پر کھالیں اور جاتے وقت توشہ دان بھر کر لے جائیں شبانہ حاجی بابا اور ان کے شاگردوں کو اصرار کر کے چوکیوں پر لے آئی اور کھانے کا دور شروع ہوا، مجاہد شبانہ کے اس اقدام پر بہت خوش تھے نہ صرف وہ بلکہ مہمان بھی۔

مجاہد اور شبانہ کھلے حصے میں رکھی کرسیوں کے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے وہاں کوئی نہیں تھا مجاہد نے سگریٹ سلگایا اور لگے کش لینے بزرگوں کے سامنے یہ حرکت نہیں ہو سکتی تھی لہذا وہ آرام سے سگریٹ پینے لگے باتوں میں دھیان نہیں رہا

کون کس طرح کھڑا ہے اس طرف اندھیرا بھی تھا کس طرح مجاہد کے ہاتھ میں جلتے ہوئے سگریٹ نے گستاخی کی اور شبانہ کے زرین آنچل سے ٹکرا گیا چنگاری دھیرے دھیرے پھیلنے لگی شبانہ اور مجاہد ماضی اور مستقبل کی باتوں کے درمیان تھے چنگاری کا احساس کسی کو نہ ہوا ، زرین آنچل پہ چنگاری آگے بڑھی اور شبانہ کی پشت کی طرف سے اوپر چڑھ آئی کاندھے کے پچھلے حصے پر شبانہ کو ذرا گرمی محسوس ہوئی ابھی اس نے دیکھا تو کچھ چبھن سی محسوس ہوئی اور یہ چنگاری کی چبھن جلن بن کر پشت پہ پھیل گئی بلاوز سلک کا تھا شبانہ درد سے بلبلا کر چیخ پڑی، مجاہد کے ہوش اڑ گئے انھوں نے فوراً اپنا کوٹ اتار کر شبانہ کی پیٹھ پر رکھ کر زور سے دبایا پھیلتی ہوئی آگ بجھ گئی لیکن شبانہ کی چیخ سن کر کچھ لوگ ادھر آگئے تھے خورشید بیگم بھی تھیں مجاہد میاں کو دیکھتے ہی کوٹ لے کر رفوچکر ہو گئے سگریٹ نوشی کا بھرم کھلنے کے ڈر سے ....

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو تھے یہ کیا ہوا ؟ آخر شبانہ کی کھلی پیٹھ دیکھ کر خورشید بیگم پوچھ بیٹھیں .... جلی ہوئی پیٹھ ساڑی کا آدھا آنچل جلا ہوا "کیا ہوا ہے آخر کچھ کہو بھی ....

شبانہ کی سسکیاں رک نہیں پا رہی تھیں وہ کہتی بھی تو کیا اماں جان کے سامنے اپنے شوہر کا راز کیسے اگلتی ؟ وہ ہچکیوں پہ ہچکیاں لے رہی تھی دوسرے بھی سب حیران تھے آخر خورشید بیگم کے اندر چھپی "ساس" باہر آگئی انھوں نے ہنگامہ مچا ڈالا، جانے شبانہ اندھیرے میں کس کے ساتھ تھی دیکھو ! سگریٹ پینے والا کوئی شخص اس کا کوئی ہے جو اسے ملنے آیا تھا اور شاید وہ رقابت میں اسے جلا گیا" ارے کیا ایسی ہوتی ہے گھر کی بہو ؟ یہی لچھن ہوتے ہیں شریف زادیوں کے ؟ بتاؤ

شبانہ کون تھا وہ ؟ بتاؤ ؟ ساس چلا چلا کر کہ پوچھ رہی تھی مہمان جمع حیران کھڑے تھے معاملہ سمجھنا چاہ رہے تھے کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شبانہ کی معصومیت پہ یقین کریں یا خورشید بیگم جیسی جہاندیدہ خاتون کی دلیل پر......

شبانہ ! میں تم کو مجاہد سے طلاق دلوا کر رہوں گی اس طرح گری ہوئی عورت " میرے بیٹے کے ساتھ بیوی بن کر نہیں رہ سکتی، خورشید بیگم نے فیصلہ صادر کردیا شبانہ صرف ہچکیوں کی زبان بنی رہی، باوا جان کو ان کے دوست کہیں مشاعرے میں ساتھ لے گئے تھے۔ خورشید بیگم نے خوب شبانہ کی بے عزتی کی شبانہ کا لباس ہی نہیں بلکہ آج کسی چنگاری نے اس کا دل بھی خاک کر ڈالا تھا اس کی ساس نے اس پہ بدچلنی کا الزام لگایا تھا یہ چنگاری شبانہ کو خاک کر گئی۔ خورشید بیگم نے شب خون مارا تھا اس کو شادی کی پہلی سالگرہ کے دن بے عزت کیا تھا اس کی پاکدامنی پر شبہ کیا تھا پوچھے بنا، معلوم کئے بنا، گواہی کے بنا، اس کی قسمت کا فیصلہ مہمانوں کے سامنے کیا تھا شبانہ چکرا کر گر پڑی وہ آسمان سے گرتی تو شائد بچ جاتی لیکن وہ نگاہوں سے گر چکی تھی اسے اٹھانے والا مجاہد بھی موجود نہ تھا.....

دوسرے دن شبانہ کا جنازہ لے جایا جانے لگا تو سب سے زیادہ خورشید بیگم کی چیخیں بلند ہورہی تھیں۔ ہائے میری بچی ! میری عزت دار پاکدامن بہو، ہائے میری بچی میری غلطی نے تیری جان لے لی، میری سمجھ پر پردہ پڑ گیا تھا مجھے معاف کردینا بیٹی !

شبانہ الزام کے صدمے کی تاب نہ لا کر ختم تو ہوگئی لیکن مجاہد کے دل میں ایک "چنگاری" کا درخت اگ گئی۔ ؟

قید اور رہائی

میں کہتی ہوں ورشا تو آپ کے روی کو راکھی باندھ ہی دے، بنا رشتے کے میل جول سماج کی نگاہوں میں کھٹکتا رہے بیٹی! ماں، ورشا کو اونچ نیچ سمجھا رہی تھی، نہیں ماں! میں رشتے کی پجارن نہیں ہوں بھلا دیوتاؤں سے کہیں رشتے کئے جاتے ہیں؟ انھیں کسی بھی بندھن میں نہیں باندھا جا سکتا، ماں! یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اور روی سماج کی نگاہوں میں کھٹک جائیں گے، اور اگر ایسا ہو بھی تو مجھے پروا نہیں، تم دیکھ رہی ہو، جو آج کل واقعات ہو رہے ہیں، بھائی نے بھائی کو قتل کر ڈالا، بھائی نے بہن کا سودا کر ڈالا ــــــ یہ رشتے اگر نہ ہوتے تو شاید یہ جرم بھی عام نہ ہوتے ایسا بہت کم سننے میں آتا ہے کہ کسی اجنبی نے رشتہ کے بغیر کسی کا خون کر دیا ہو، ماں! رشتے دیوار ہوتے ہیں جن کو گرایا نہیں جاتا رشتے، فاصلوں کا دوسرا نام ہے، رشتے اگر نہ ہوں تو فاصلے بھی نہیں ہوتے، محبت کے درمیان دیواریں مت کھڑی کرو ماں، ورنہ دل، کھنڈر ہو جائے گا جہاں ویرانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، کچھ بھی نہیں ہوتا، ماں مجھے مجبور مت کرو کہ میں روی کو راکھی باندھوں، یہ دھاگہ بھی دنیا والوں کے ہونٹ سینے میں ناکام ہو جائے گا، ماں مجھ پہ بھروسہ کرو، میں روی سے محبت کرتی ہوں، اُس پہ بھروسہ ہے مجھے اس سے کوئی

خوف نہیں، زبردستی جال ڈال کر اڑتے ہوئے پرندوں کو قید کرنا گناہ ہے، محبت رشتے میں قید ہو کر اپنی طاقت پرواز کھو بیٹھتی ہے، میں رشتے کی آڑ لینا نہیں چاہتی میں نے غلط تو نہیں کہا ناماں! ورشا نے ماں کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا، کچھ دیر خاموشی رہی پھر ماں نے کہا" بیٹی! میں تیرے خیالوں کی قدر کرتی ہوں تیرے جذبات سمجھتی ہوں مگر کیا کروں، دنیا سے ڈر لگتا ہے دنیا کے اصول کو میں کیسے توڑ سکتی ہوں؟ میں تجھے بدنامی سے بچانا چاہتی ہوں اور پھر تو کنواری ہے تیری شادی یوں بھی دولت نہ ہونے سے آج مشکل لگ رہی ہے مگر آنے والے کل میں "ناممکن" ہو کر نہ رہ جائے تو میری بات سمجھنے کی کوشش کر ---------

ماں" نیند آرہی ہے رات زیادہ ہوگئی جلد سو جاؤ" ورشا بھی اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی۔ روی ان ہی کے محلہ کا ایک لڑکا تھا جو ورشا سے ملنے آیا کرتا تھا وہ سرکاری کالج میں لکچرر کے پوسٹ پر تھا کبھی کبھی تبادلۂ خیال اور امتحانات کے قریب ورشا اور روی کا ملنا جلنا زیادہ ہو جاتا تھا ورشا کی دو بہنیں بہت چھوٹی تھیں ایک بڑا بھائی امریکہ میں ملازم تھا غرض کہ اوسط درجہ کے اس خاندان کی حالت اس چراغ کی طرح تھی جسے بجھا ہوا کہہ سکتے ہیں، بس سلگ رہا تھا ------

ماں حسب دستور ورشا کو سمجھاتی رہی اور ورشا ہمیشہ ٹالتی رہی آخر ایک دن وہ واقعہ ہو ہی گیا جس دن کے ڈر سے ماں نے گھنٹوں ورشا کو سمجھانے کی کوشش کی تھیں۔ دلی کی بھری پری سڑکوں کے درمیان بنے ایک چھوٹے سے پارک میں ورشا اور روی کو محلہ کی ماسی کامنی نے بے تکلف ہنستے دیکھ لیا۔ کامنی محلہ کی ماسی تھی کوئی آسان بات نہ تھی کہ ان کے علم اور اجازت کے بغیر محلہ والے کوئی قدم اٹھا سکیں وہ جدھر چاہتی آگ

لگاتی جدھر چاہتی مینہ برساتی، نہ جانے ان کا گذار اُدھر سے کیوں ہوا اور وہ بھی اس وقت جب کہ ردی نے کتاب سے ہلکی سی چپت ورشا کے سر پر لگائی اور خود بھی ہنس پڑا، بہر حال کامنی ماسی محاذِ جنگ کے جانباز سپاہی کی طرح ورشا کی ماں رما سے ملنے پہنچ گئی اور وہ ایٹمی دھماکے کیے کہ رما دیوی واقعی دہل کر رہ گئی جو کچھ کامنی نے دیکھا وہ الٹ پلٹ کر کے رما کو سنا دیا، ماں کا دل تو اس معاملے میں بہت کمزور ہوتا ہے کسی مذھب کی ہو یا کسی عمر کی ہو، ماں، ماں ہی ہوتی ہے ۔

ورشا لوٹی تو ماں کے چہرے پر گھنگھور بادل نظر آئے جو برسنے کو تیار تھے آخر ماں کی ممتا کا تختہ الٹ ہی گئی، ستیہ ناس ہوا تیرا، بھگوان تجھے کبھی اپنے چرنوں میں جگہ نہ دیں گے، ایسے ہی منہ کالا کرنا تھا، اسی لیے تو نے روی کو راکھی باندھنے سے منہ موڑ لیا، تجھے ذرا بھی لاج نہ آئی، روی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پرکھوں کی عزت کا خیال تو کیا ہوتا؟ ھائے، میں بدنصیب یہ سب دیکھنے کو زندہ رہ گئی، ہے بھگوان یا مجھے بلا لے یا اس کل موہی کا ستیہ ناس کر دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ماں! آخر ہوا کیا ہے، میں نے کیا کیا ہے؟ ورشا معصومیت کی تصویر بنی ہوئی تھی ۔ کیا تو روی کے ساتھ پارک میں نہیں تھی؟ ماں نے پوچھا، ہاں، تھی تو؟ اب اس سے آگے بھی کیا مجھکو ہی کہنا پڑے گا؟ ماں غصہ سے لرز رہی تھی، ورشا! کان کھول کر سن لے، تو روی سے نہیں ملے گی اور ویسے بھی روی شادی شدہ ہے کیا تجھے معلوم نہیں؟ ھاں، ماں مجھے معلوم ہے، لیکن مطلب تم غلط نکال رہی ہو، مجھے روی کے شادی شدہ یا کنوارا ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے روی سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی، محبت کا مطلب شادی ہی کیوں لیا جاتا ہے؟ کیا انسان کو انسان سے محبت

نہیں ہو سکتی ؟ ماں، میرے بارے میں تم نے کسی سے غلط سن لیا ہے، اور اب ناحق غصہ بھی کر رہی ہو، دیکھو یہ سب رشتے کی وجہ سے ہے، کوئی اور کیوں مجھے نہیں ڈانٹ رہا، کیوں اڑوس پڑوس کے لوگ اعتراض نہیں کرتے ؟ ہائے، تو تو اندھی ہو گئی ہے ورشا، کامنی ماسی نے تم دونوں کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور وہ سارے محلے میں ڈنکے کی چوٹ پر سناتی پھر رہی ہے کہ تو اور روی ــــــــــــ ماں کی زبان لڑکھڑا گئی، ممتا کا الٹا ہوا تختہ پھر سیدھا ہونے لگا تھا، میری بچی، غلط راستے پر چلتے ہوئے اگر معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ غلط ہے تو لوٹ جانا چاہئے بیٹی، لوٹ جانا چاہئے، تو بھی لوٹ جا ورشا، تو بھی لوٹ جا ــــــــــــ ورشا کو پہاڑوں کے نیچے آجانے کا احساس ہوا، وہ تو سارے زمانے کی پرواہ کئے بغیر اپنے نظریات کو روبہ عمل لانے پر تلی ہوئی تھی، مگر ماں نے ایک ہی دھکے میں کئی پہاڑ اس کے وجود پر گرا ڈالے تھے، شمشان گھاٹ کا وہ چبوترہ [illegible] آنکھوں میں گھومنے لگا، جہاں پر چتا کو آگ دینے والے رشتہ داروں کا ہجوم ہوتا ہے ورشا کا ذہن چتا کی طرح ماؤف ہو چکا تھا اور اس چتا کو آگ دینے کے لئے خود اس کی ماں آگے کھڑی ہوئی تھی ــــــــــــ

ورشا نے سامنے آئی ہوئی چوٹی کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا جیسے ماں کی راکھی والی بات وہ ابھی تک پس پشت ڈالتی آئی تھی، زبردستی گرائے ہوئے پہاڑوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے اس نے پاؤں کے سینڈل میز کی طرف اچھال دئے اور چپ چاپ جا کر سو گئی ؛ صبح حسب معمول ناشتہ کر کے تیار ہوئی اور کالج جاتے ہوئے کہا ماں، میں جا رہی ہوں، بی اے پڑھنے والی ورشا نے اسکول جانے والی ننھی سی لڑکی کی طرح ماں سے کہا، ہاں، بیٹی جا مگر آتے وقت راکھی ضرور لے آنا، ورشا کھلکھلا کر ہنس پڑی، ساڑی کا پلو اپنے اوپر اچھی

طرح لیٹی ہوئی بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑی آج اس نے ماتھے پر بندی نہیں لگائی تھی! د
شام ڈھل رہی تھی، ماں کا دل تیز رفتار ٹرین کی طرح دوڑ رہا تھا کوئی اسٹیشن نہیں تھا جو
یہ دل کی ٹرین ذرا دیر رُک سکتی ۔۔۔۔۔ چھک ۔۔۔۔ چھک ۔۔۔ چھک ۔۔ ورشا۔ ورشا۔
ورشا۔ ماں کے کانوں میں کبھی کامنی ماسی کی دی ہوئی خبریں گونجتیں تو کبھی ورشا کی پر دلیل
باتیں رس گھولتیں ۔ ماں کو اپنی بیٹی پر وشواس تو ہوتا ہی ہے مگر یہ کم بخت ممتا بڑی شکی
ہوتی ہے محبت کی یہ وہ قسم ہے جو اندھی نہیں ہوتی بلکہ دو سے زیادہ آنکھیں رکھتی ہے جو ہر طرف
دیکھتی ہیں ۔ ماں دالان میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی جیسے کہ وہ سماج کی دربان ہو اور سماج ایک
آفیسر کی طرح اندر بیٹھا ہو اور دربان کی اجازت کے بغیر کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا ہو ۔۔۔۔
ہرگز نہیں ۔۔۔۔

وقت اپنی مرضی سے آتا اور جاتا ہے اس وقت بھی وہ ایک بادشاہ کی طرح
باوقار انداز میں دھیرے دھیرے گذر رہا تھا، ممتا کے دل کی ٹرین اتنی ہی تیز رفتار تھی۔
۔۔۔ رات کے بارہ بجے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز پر ضعیف ماں کم سن بچی کی طرح دروازے
کی طرف دوڑ پڑی ۔ دروازہ کھولا، ارے کون ہو تم ؟ ممتا اچانک اندھی ہو گئی ۔ ماں
سے گلے لگتے ہوئے ورشا نے کہا ماں، مجھے دعائیں دو اور سسک پڑی پیچھے روی کھڑا تھا
مسکراتے ہوئے، غرور کے ساتھ ۔۔۔۔!
ماں سمجھے بنا ورشا کو پیار کرتی جارہی تھی آخر سب دالان میں آکر بیٹھ گئے ماں نے آگے بڑھ کر
نائٹ بلب بجھاتے ہوئے ٹیوب لائٹ کا سوئچ آن کر دیا ۔۔۔۔ سفید روشنی پھیل گئی ۔
ارے، کیا تم لوگ کسی ڈرامے سے آئے ہو، یہ کیا ہے ؟ ماں نے ورشا کی سُرخ اور
جگ مگ کرتے لباس پر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا پھر روی پر نظر ڈالی جو سرمئی سوٹ میں ملبوس

تھا، پھولوں کے ہار دونوں کے ہاتھوں میں لدے تھے ماں، تم کہتی تھی نا، کہ محبت کو رشتہ کا نام دینا ضروری ہے ہم نے سماج سدھار تنظیم کی موجودگی میں شادی کرلی ہے جیسے سماج قبول کرتا ہے -------

ماں کا دل سینے میں زخمی کبوتر کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا، لیکن فوراً ماں نے خود کو سنبھال لیا، اس کی بیٹی نے واقعی سماج میں ایک جائز قدم اٹھایا تھا دونوں ایک ہی ڈوری سے بندھے سماج کے سامنے کھڑے ہوئے رشتوں کے قیدیوں کو للکار رہے تھے، ماں، میں اب جاؤں ؟ ورشا نے پوچھا ماں نے کہا، کہاں ؟ ورشا بولی اپنے گھر" ماں نے کہا نہیں آج یہیں رہ، کل مجھے دنیا کو منہ دکھانا ہے تو شان سے دکھاؤں گی ------

ورشا نے اپنا لباس بدل ڈالا اور دن کے اجلے پیرہن میں وقت پھر آکھڑا ہوا ماں محلے کے سبھی لوگوں کو اکٹھا کر کے دعوت کا اہتمام کیا تھا اور کامنی ماسی کو بھی بلوالیا تھا، تقریب کے ختم ہونے کے بعد دلہا دلہن کو رخصت کرتے ہوئے ماں نے ایک لمبی سانس لی جس میں جیت بھی تھی اور ہار بھی ------!

سرگوشیاں

اپنے فلیٹ کا دروازہ بے وجہ کھول کر وہ لمبی سی راہداری جہاں ٹیوب لائٹس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی دیکھتے ہوئے سوچنے لگی، اسی طرح کی لمبی سی ٹرین میں وہ پہلی بار کئی برس پہلے بمبئی گئی تھی اپنے اباجان کے ساتھ، بوری بندر اسٹیشن پر گاڑی نے گرتی ہوئی بلی کے پنجوں کی طرح رکنے کی کوشش میں اسے سامنے والی سیٹ پر دھکیل دیا تھا وہ دھڑام سے اس آدمی کی گود میں جا پڑی تھی جو ہیٹ پہنے منہ میں سگار دبائے کھڑکی سے باہر رینگتی گاڑی کے ساتھ دوڑتے قلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے گرنے سے وہ چونک پڑا "اوہ بے بی" اس کے منہ سے نکلا وہ کھسیا کر دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس آدمی کو گھورنے لگی دل میں سوچتی رہی کم بخت کہیں کا، یہ اگر نہ ہوتا تو میں کیوں اس پر گرتی؟ خالی سیٹ پر گری ہوتی .... رخسانہ ابھی دسویں سال میں تھی لیکن اس کی سوچ بالکل الگ تھی اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ سارا الزام مقابل پر دھر دیا کرتی خیر! بوری بندر اسٹیشن پہ ٹرین رکتے ہی دھما چوکڑی شروع ہوگئی، سوٹ کیسوں اور بیٹیوں کی آوازیں، چیختے چلانے کی آوازیں، کہیں سے قلی گھسے پڑ رہے تھے تو کہیں مسافرین اترنے کی کوشش میں دروازے میں ہی پھنسے جا رہے تھے، خدا خدا کرکے رخسانہ اور اس کی

آپا رادھا اور اس کے ابا جان بھی اتر گئے سکنڈ کلاس کا سفر بڑا دلچسپ ہوتا ہے وہ بیٹ والا کہیں غائب ہو گیا تھا ابا جان نے قلی کو سامان دے کر ٹیکسی بلوائی اور چل پڑے کسی ہوٹل کی تلاش میں ایک معیاری ہوٹل میں پہنچے کمرہ لیا اور اندر داخل ہوتے ہی رخسانہ دھڑام سے بیڈ پر گر پڑی اور زور دار جماہی انگڑائی کے ساتھ لیتے ہوئے کہا ابا جان بھوک لگی ہے بمبئی میں کھانے کو کیا ملے گا؟ ابا جان نے ڈانٹا بد تمیز! پہلے نہالو سفر کی تھکن دور ہو جائے گی، رخسانہ حمام میں گھسی نل کھولتے ہی بارش میں بھیگنے لگی یعنی کہ شاور کھل گیا رخسانہ کو یہ انداز بہت پسند آیا کافی دیر تک نہاتی رہی، ابا جان نے کئی دفعہ دروازے پر دستک دی آخر وہ حمام سے نکل آئی ابا جان اور آپا رادھا میز پر لگے کھانے کے ساتھ اس کے منتظر تھے رخسانہ بھیگے بال لئے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑی بچھلی، بریانی پڈنگ نہ جانے کیا کیا، کھانے کے بعد رخسانہ سو گئی یہ لوگ دوپہر سے پہلے پہنچے تھے اب مغرب ہو رہی تھی۔ ابا جان نے رخسانہ کو اٹھایا اور چائے پینے کو کہا رخسانہ چائے پی کر ابا جان کے کہنے کے مطابق تیار ہوگئی اور یہ تینوں فلم دیکھنے چلے بمبئی کی لبرٹی ٹاکیز میں کوہ نور فلم چل رہی تھی جس کے گانے رخسانہ کو بہت پسند تھے وہ اکثر گایا بھی کرتی تھی فلم بہت پسند آئی اس نے آپا رادھا سے پوچھا رادھا بائی! یہ شہنائی تو مجھے معلوم ہے لیکن یہ پیار کی شہنائی کیسی ہوتی ہے؟ رخسانہ کے کانوں میں ابھی تک فلم کا گیت بج رہا تھا" دل میں بجیں پیار کی شہنائیاں"۔۔۔۔۔۔ رادھا نے کہا بی بی آپ تھوڑی سی اور بڑی ہو جائیں تو معلوم ہوگا! رخسانہ منہ بنا کر رہ گئی دوسرے دن صبح ہوئی سب ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کا آرڈر دئے منتظر تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی ابا جان نے دروازہ کھولنے کو کہا

رخسانہ نے دروازہ کھول دیا " ھیلو بے بی " کیسی ہو کہہ کر وہی " ہیٹ والا " اندر گھس آیا اور بلا تکلف شریک ہوگیا پھر خدا حافظ کہہ کر جانے لگا اور رخسانہ کے چہرے پر ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا رخسانہ کو اس قدر غصہ آیا کہ چلا پڑی ابا جان! یہ کمینہ ہے، چور ہے، حرامی ہے یہ کیوں آیا تھا؟ ابا جان نے بیٹی کو سمجھایا کہ اس کا یہاں کاروبار ہے اس سلسلہ میں وہ اکثر مسافروں سے ملتا رہتا ہے رخسانہ نے کہا وہ مجھے پسند نہیں آئندہ اسے نہ آنے دیجئے۔ اچھا بیٹی، اچھا ابا جان نے تسلی دی اور اخبار پڑھنے میں لگ گئے۔ رخسانہ اپنا راگ مالا اپنے ساتھ لے آئی تھی اس نے اس سے دل بہلانا شروع کیا ؎

گا میرے من گا۔۔۔۔۔۔

یونہی بتائے جا دن زندگی کے۔۔۔۔۔ گا میرے من گا۔۔۔۔۔۔

بہر حال مسلسل ماؤتھ آرگن بجانے سے اس کے ہونٹوں میں جلن ہونے لگی اس نے بجانا بند کردیا اور لگی سی، سی کرنے رادھا پریشان ہوگئی، گلابی ہونٹ نہ صرف سرخ ہوگئے تھے بلکہ ایک پتلی سی خون کی لکیر بھی نمایاں تھی رادھا پریشانی میں شکر لے کر رخسانہ کے ہونٹوں پر لگا دی جلن کچھ کم ہوتی لیکن رخسانہ پر گانے کی دھن سوار تھی وہ پھر شروع ہوگئی ؎ ڈھل چکی شامِ غم، مسکرا لے صنم۔۔۔ اچانک گاتے گاتے رک گئی ابا جان! یہ صنم کے معنی کیا ہیں؟ ابا نے کہا، صنم کے معنی ہیں " بت " تو ابا جان! یہ بت کو مسکرانے کے لئے کیوں کہتے ہیں کہ ؎

ڈھل چکی شامِ غم، مسکرا لے صنم

اک نئی صبح دنیا میں آنے کو ہے، کیا معنی ہوئے ؟

کیا کہہ رہی تھی لیکن اس کی حالت بہت خراب تھی بال کھلے ہوئے، ہاتھ زخمی، چہرہ لال پھر دو آدمی اسے پکڑ کر ایک روم میں لے گئے پھر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا ایک سناٹا چھا گیا۔ ابا جان نے ہوٹل کے مینیجر سے بل منگایا بل ادا کیا اور وہاں سے چل پڑے اپنے کسی دوست کے پاس، یہ بہت بڑی بلڈنگ تھی اسی میں لفٹ کے ذریعہ خدا معلوم کونسی منزل پہ سب پہنچے ایک فلیٹ کے دروازے پر دستک دی ایک بہت ہی مدبر خاتون نے دروازہ کھولا اور ابا جان کے آگے جھک سی گئی، اور اندر بلا لیا، رخسانہ کو بہت سے پیار کر ڈالے رادھا کو بھی اپنے ساتھ کرسی پہ بٹھا لیا ابا جان نے کہا خانم! تمہارے میاں کہاں ہیں؟ خانم بولیں بس ابھی آتے ہوں گے یہ دو کمروں والا فلیٹ تھا جو بڑے سلیقے کا ثبوت دے رہا تھا رخسانہ اس گڑیا کی طرف دیکھ رہی تھی جو دیوار میں بنے ایک کارنر پہ بیٹھی مسکرا رہی تھی خانم نے رخسانہ کی پُر اشتیاق آنکھیں دیکھ کر گڑیا اس کے ہاتھ میں دے دی، رخسانہ کا جی چاہا کہ وہ خانم کے ہاتھ چوم لے مارے حجاب کے مگر ایسا نہ کر سکی دل ہی دل میں خانم سے محبت محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی خانم نے دروازہ کھولا اور ایک شخص کو اندر بلا لیا اور ابا جان سے کہا افسر بھائی یہ میرے شوہر ہیں، اور اپنے شوہر سے کہا یہ میرے پہلے شوہر کے عزیز دوست ہیں۔

ابا جان محو حیرت تھے خانم! کیا تم ...... کیا تم نے ...... خانم نے جھٹ سے کہا ہاں! افسر بھائی عثمان کے انتقال کے بعد میں نے دوسری شادی کر لی ابا جان کچھ آبدیدہ کچھ دہشت زدہ وہاں سے اجازت لے کر سیدھے ریلوے اسٹیشن گئے رات وہیں ویٹنگ روم میں گذاری اور کسی طرح ٹرین میں سیٹ

لے کر حیدرآباد واپس ہوگئے۔ رخسانہ اپنے اوٹ پٹانگ گیت لکھنے میں مصروف تھی
کہ کال بیل کی آواز پیا بابا نے دروازہ کھولا اور زندگی میں پہلی بار رخسانہ کی طرح چلا
پڑے ان کے عزیز دوست عثمان ان کے در پر شان دار سوٹ پہنے کھڑے تھے
تم عثمان ؟ ہاں میں! عثمان نے افسر صاحب کے شانے پر ہاتھ مارا اور بے تکلف
اندر آگئے " لیکن وہ خانم نے تو کہا تھا ؟ کہ ۔۔۔۔کہ" ابا جان ہکلا گئے عثمان نے
قہقہہ لگایا اور کہا یہ تو ہم میاں بیوی پیسہ کمانے کی ترکیب پر عمل کرتے ہیں ورنہ
بمبئی میں کیسے جیتے ؟ وہ ہر سال اپنے شوہر کو مارتی ہے دوسری شادی کرتی اور
کافی رقم مجھے دیتی ہے اور سب ۔۔۔

رخسانہ کے شوہر ہندوستان سے باہر گئے ہوئے تھے بچے اپنے اسکول کی کسی فنکشن
میں گئے تھے رخسانہ رات کی تنہائی سے گھبرا کر دروازے میں کھڑی تھی آج یہ واقعہ
رخسانہ کو اس لئے یاد آگیا کہ ساجدہ بیگم اپنے گمشدہ شوہر کا غم منائے بغیر ٹھاٹ سے
رہ رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور بلڈنگ کے لوگ عجیب عجیب سرگوشیاں کرنے
لگے تھے۔ ماضی کے اجالے اسے حال کے نیم تاریک ماحول میں لے آئے تھے"
راہداری میں لگی ٹیوب لائٹ کی روشنی اسے مدھم لگنے لگی اور اس نے فلیٹ کا دروازہ
اندر سے بند کر لیا !!!

اندھیرے

فرید اور فراز نے اپنی قمیص اتار کر پھینک دی تھیں اور اپنے گھر کے آنگن میں ایک دوسرے پر گھونسوں کی بارش کرتے جا رہے تھے جیسے کہ پہلوانوں کا مقابلہ دنگل میں ہوتا ہے ماں بے چاری چلا چلا کر حیران، بہنوں نے الگ کہرام مچا رکھا تھا، دوسرے سب بھائی چھوٹے تھے اور سہمے ہوئے تھے اسی وقت باہر سے رضوان صاحب اندر آئے اور جو یہ تماشہ دیکھا خود بھی دنگل میں اتر گئے اور ایک مستعد ریفری کی طرح گردنیں پکڑ کر دونوں کو علحدہ کیا، فرید اور فراز باپ سے کسی حد تک شرمندہ ضرور ہوتے مگر ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے دور ہٹ گئے یہ لوگ سرحدی پٹھان تھے سب کے سب نہ صرف حسین تھے بلکہ قابل رشک صحت بھی رکھتے تھے۔

رضوان صاحب کے ایک دوست کا بے تکلف یہاں آنا جانا تھا ان کی اکلوتی لڑکی "سارہ" بے حد حسین تھی "اندھیرے میں" ریڈیم کے مجسمہ کی طرح روشن رنگت اور بہت ہی گھنے لمبے بال نے اسے آسمانی مخلوق بنا رکھا تھا اور فرید و فراز دونوں اسی بات پر اڑے تھے کہ وہی سارہ سے شادی کریں گے۔ کیوں کہ رضوان صاحب سے انھوں نے سن لیا تھا کہ سارہ ان کی بہو بننے والی ہے لیکن بیوی کس کی بنے گی، اس کا ابھی تک اعلان نہ ہوا تھا؟ ماں کے پاؤں پہ سر رکھتے ہوئے سب سے بڑے بیٹے نے دہائی دی "امی جان سارہ مجھے دے دیجئے امی جان نے دھتکار دیا چل! پاگل! وہ تو تجھ سے بہت چھوٹی ہے عمر میں بھی اور دیکھنے میں بھی تُو تو شیر کی طرح ہے اور وہ نازک دھان پان سی۔ یہ فراز کو سجے گی وہ چھریرے بدن کا ہے نا؟

فرید نے امی جان کے پاؤں سے سر اٹھالیا اور دل میں اس کے ارادوں نے ...... ! فرید بول پڑا امی جان ! میرے ایک دوست کی بہن بہت حسین ہے فراز کی شادی اس سے کردیں گے سارہ تو مجھے چاہیئے۔ ماں نے ہاں ہاں کرکے ٹال دیا۔ ایک بار فراز امی جان کے گلے لگ گیا، بانہیں گلے میں ڈال کر جھولنے لگا پیاری پیاری امی جان ! آپ مجھے کتنا چاہتی ہیں ؟ ساری دنیا میری امی جان پر سے وار دینے کو جی چاہتا ہے۔ ماں نے مسکراتے ہوئے چہیتے بیٹے فراز کو دیکھا اور بے ساختہ پیشانی چوم لی فراز نے آہستہ سے پوچھا امی جان کیا سارہ کی شادی ہو رہی ہے ؟ ماں نے کہا ہاں ! فراز فٹ بال کی طرح اچھل گیا مگر کیوں ؟ ماں نے کہا اس کے ماں باپ اس کی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر کس سے ؟ فراز نے حلق سے کچھ ایسی آواز نکالی جس میں سسکی بھی تھی، دھمکی بھی ماں نے کہا تم سے ..... ! اور مسکرادیں فراز نے خود کو آسماں پر جگمگاتی کہکشاں میں محسوس کیا اور ماں کے قدم چوم لئے۔ چھوٹی بہنوں کی چوٹیاں کھینچ ڈالیں چھوٹے بھائیوں کے کان پکڑ لئے اور فرید بھیا کے کمرے کی طرف دوڑ گیا اور چلانے لگا فرید بھیا ! سارہ سے میری شادی ہو رہی ہے، اچانک ایک زوردار طمانچہ فراز کے منہ پر پڑا، فرید کمرے سے نکل کر یہ دھماکہ خیز خبر سنتے ہی بھپر گیا اور پھر دونوں بھائی آپس میں ٹکرا گئے اور یہ سلسلہ بڑھتا گیا، بھائی، بھائی کا رقیب ہو گیا ماں باپ پریشان ہو گئے کہ اب اس طوفان کو کیسے روکیں دن رات کے جھگڑے ہوتے رہتے۔ بھائی پر بھائی اسی طرح ٹوٹ پڑتا جیسے قصاب کسی بکرے کی گردن پر نظر رکھتا ہے۔

اچانک سارہ کے والدین ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گئے سارہ اکیلی رہ گئی رشتے دار برائے نام تھے تنہا حسین لڑکی ضعیف نانی کے ساتھ غیر محفوظ تھی اور محلے کے ہر گھر کے کسی نہ کسی نوجوان کو اس کی فکر رہنے لگی محلہ کی خواتین سارہ کے گرد حلقہ بنانے کی کوشش میں لگی رہتیں کہ کسی طرح اس چنچل ہرنی کو پکڑا جا سکے مگر وہ سب کو جھٹک دیتی رضوان صاحب کی لڑکیاں اس کے پاس آتیں اور بھابی، بھابی کہہ کر ستاتیں سارہ کو سخت غصہ آتا رضوان صاحب اکثر رات کو آتے اور فرید کو بھی ساتھ لے آتے فرید خواہ مخواہ بات کرنے کی کوشش کرتا مگر سارہ اس قدر تنک چڑھے پن سے جواب دیتی کہ فرید حیران رہ جاتا خوبرو فرید اپنی بے عزتی سمجھ جاتا کسی طرح سارہ سے شادی ہو جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا یہ سوچ کر خود کو دلاسہ دیتا رہتا، رضوان صاحب کی بیگم دن بھر سارہ کے یہاں رہتیں ان سے ملنے کے بہانے فراز بے وجہ کئی چکر لگاتا منہ سے کچھ نہیں کہتا مگر بڑی شوخی سے سارہ کو سلام کرتا رہتا سارہ کو فراز سے بھی خدا واسطے کا بیر تھا وہ اس کے سلام کا جواب دینا بھی "کسرِ شان" سمجھتی۔

ایک دن فراز کی امی نے سارہ سے پوچھا بیٹی کب تک تم اکیلی اپنی نانی کے ساتھ رہو گی ماشاء اللہ سمجھدار ہو کچھ شادی کے بارے میں فیصلہ کر لو فراز تم پر جان دیتا ہے تمہارے بغیر اس کا ایک دن ایک برس بن گیا ہے سارہ نے گردن جھٹکی اور بال پیٹھ پر بکھر گئے سارہ نے کہا خالہ جان میرے ماں باپ نے کافی مال چھوڑا ہے اور نانی میرے ساتھ ہیں پھر مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے؟ فراز کی شادی اگر کرنا ہے تو آپ کوئی اور لڑکی دیکھئے مجھے تو فراز سے شادی نہیں کرنی ہے۔

بیگم رضوان نے اس قطعی جواب کو سن کر دوسرا تیر چلایا پھر بولیں

بیٹی فراز کو جانے دو فرید تم پر مرتا ہے تم فرید سے شادی کرلو! سارہ کا پارہ چڑھ گیا فراز جان دیتا ہے، فرید مرتا ہے تو آپ ایک قبرستان بنا دیجئے اپنے بیٹوں کے لئے.....

...... بیگم رضوان حواس باختہ گھر لوٹیں اور سب کے سامنے ساری بات سنا دی، فراز چپ چاپ باہر نکل گیا، اور فرید اپنے کمرے میں چلا گیا شام سے رات ہوئی نہ فراز گھر لوٹا نہ فرید کمرے سے باہر نکلا ماں نے لڑکیوں سے دیکھنے کو کہا تو معلوم ہوا کہ فرید بے سدھ لیٹے بستر پر پڑا ہے بیگم رضوان نے بیٹے کو دیکھا تو رونے لگیں، فرید نے رضوان صاحب کی نیند کی گولیاں کھالیں تھیں اور منہ سے کف جاری تھا کسی طرح دواخانہ لے جایا گیا مشکل سے جان بچی، دوسرے دن بھی فراز کا پتہ نہ تھا اچانک دوپہر میں دروازے پر دستک ہوئی رضوان صاحب باہر نکلے پولیس والے کھڑے تھے رضوان صاحب سے کچھ کہہ کر چلے گئے رضوان صاحب گھر میں آکر سارا قصہ سناتے ہوئے شیروانی پہن کر باہر نکل گئے معلوم یہ ہوا تھا کہ فراز "اقدام خودکشی" کے جرم میں پکڑا گیا اسے تالاب سے بے ہوش نکالا گیا، بچ تو گیا لیکن مجرم بن کر ...... بیگم رضوان سارہ کو کوسنے لگیں، رونے لگیں، ہائے ہائے میرے شیروں کو یہ کیا ہوگیا ارے میں حسین دلہنیں لے آؤں گی میرے شہزادوں کے لئے اس چڑیل کی اوقات ہی کیا ہے وغیرہ وغیرہ دن گزرتے گئے، سارہ کی اس دوران کہیں شادی ہوگئی، فراز نے دل پر پتھر رکھ کر ماں کے طئے کئے ہوئے رشتہ کو قبول کرلیا اور شادی کرلی، فرید اپنے غم کو شراب میں ڈبو کر جینے لگا ہر سال ایک شادی کرتا چند مہینے بعد طلاق دے دیتا کئی شادیاں اور طلاقوں سے اس کی کافی بدنامی ہوگئی فرید پر اور بھی کئی جرم ثابت ہوئے اور وہ جیل بھیج دیا گیا بیگم رضوان، فراز کی اداسیاں نہ دیکھ سکیں ان کا ہارٹ فیل ہوگیا باقی سمجھدار بچے گھر سنبھالنے لگے کیوں کہ رضوان صاحب کی شمع حیات بھی مدھم ہو رہی تھی۔

آج برسوں کے بعد سارہ نے فراز کو دیکھا تھا اپنے کسی دوست کی بہن کی شادی کے موقع پر، خیال ہوا کہ فراز سے سب کی خیر خبر پوچھے مگر اسے اپنی بے اعتنائی یاد آگئی جو اس نے ان لوگوں کے ساتھ کی تھی وہ شرمندہ سی ہوگئی پھر سے فراز کی ایک بہن فوزیہ ملی اس نے سارے واقعات سنا ڈالے سارہ کا دل بوجھل ہو گیا وہ افسوس کرنے لگی اپنی نادانی پر، کیوں کہ فراز اور فرید کی "ھائے" اُسے لگ چکی تھی وہ شادی کے بعد سے ہی شوہر کی بے اعتنائی کا شکار ہوگئی تھی رنگ روپ جا رہا دل کا چین سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہ تھا۔

سارہ اچھلتی کودتی ہرنی کی بجائے کھونٹے سے بندھی اس گائے کی طرح تھی جو اپنی کوشش سے چارہ بھی نہیں کھا سکتی شوہر تھا تو سہی مگر فرید یا فراز کی طرح چاہت دینے والا نہیں بلکہ اپنے رشتے کا احساس دلانے والا، ہمیشہ اپنی بڑائی اور مرتبہ کو اہم سمجھنے والا۔ اپنی ہر خواہش کو زبردستی سارہ پر مسلط کرنے والا، اس کی خود مختار، آزاد زندگی اس کی نادانیوں کے جالے میں پھنس چکی تھی اور سارہ اس گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی جس سے شعلہ نہیں صرف دھواں نکلتا ہے۔

کچھ ہی دن بعد سارہ نے اخبار میں فراز کے انتقال کی خبر پڑھی اور دھک سے رہ گئی اسے لگا کہ اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ فراز سے ضرور تھا وہ ایک عرصہ تک بے چین رہی اور پھر ایک دن اخبار میں ایک بڑی تفصیلی خبر بھی پڑھی جس کی سرخی تھی " جیل میں خودکشی " خودکشی کرنے والا کوئی اور نہیں تھا فرید تھا اس کا مجنوں ـــ ـــ ـــ لیلیٰ تنہا رہ گئی اس اماوس کی کالی رات کی طرح جس کے اندھیرے میں سب کچھ ڈوب جاتا ہے!!

کالی شال

رات اپنی آنکھوں میں گہرا کاجل لگا کر اور بھی سیاہ لگ رہی تھی اس سیاہ رات کی زلف پریشاں میں سیدھی سڑک مدھم سے قمقموں میں یوں لگ رہی تھی جیسے وہ سیدھی سڑک اس رات کی مانگ ہو جس میں کبھی سلیقے سے افشاں بھری گئی تھی مگر اب بکھر گئی ہو۔ ـــــــ

"آشیانہ" کے مکیں ابھی جاگ رہے تھے بارہ تو کبھی کے بج چکے تھے گھر کے مکیں بس یونہی گپیں ہانک رہے تھے "حنا" دیوان پر سو رہی تھی پاس ہی اس کا بڑا بھائی جو عمر میں اس سے دو سال بڑا تھا یعنی کہ دس سال کا تھا، سوئی ہوئی معصوم حنا کے گال پر لگے اس سیاہ تِل کو گھورنے جا رہا تھا" جو نانی جان نے نظر نہ لگنے اور آفتوں کو ٹالنے کے لئے لگایا تھا، اگر سیاہ تِل لگانے سے آفتیں ٹل جایا کریں تو کتنا اچھا ہوتا" آج آشیانہ کی طرف سیاہ ڈھاٹے میں چہرے چھپائے ہوئے سیاہ گھوڑوں پہ ظالم ڈاکو بڑھتے آ رہے تھے، رات کے سناٹے میں شہر سے دور اس حویلی کے قریب گھوڑوں کی ٹاپوں نے زندگی کی قیمتی ساعتوں کا احساس دلایا اور چوکیدار پہ چابک برساتے ہوئے یہ ڈاکو "آشیانہ" میں گھس پڑے، ذرا سی دیر میں یہاں کی ہر سمی ہوئی شئے نہ

صرف بکھر چکی تھی بلکہ لوٹ چکی تھی حنا کی ماں نے شوہر کا قتل ہوتے دیکھتے ہی اپنے گلے پر خود ہی چھری چلا ڈالی، یوں بھی عزت دار بیویاں اپنی عزت کو ساتھ ہی لے جاتی ہیں، نانی جان کے سفید سر کی پرواہ کرتے ہوئے ڈاکوؤں نے گھر کا قیمتی سامان، زیور سب کچھ لوٹ لیا۔ روتی ہوئی حنا کو جو نانی جان کی کالی شال میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ایک ڈاکو نے کاندھے پر ڈال لیا ایک اور ڈاکو نے صحت مند مراد کو اپنے قبضے میں کر لیا اور مزید رکنا نامناسب سمجھتے ہوئے جدھر سے آئے تھے اُدھر چلدیئے،

چمبل کی وادیوں میں آباد اس "ڈاکوستان" کے سردار کا نام تھا "بادشاہ" ڈاکوؤں نے آشیانہ سے لوٹے ہوئے ساز و سامان کو سردار کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا، سردار اب کی بار ہم دو جاندار چیزیں بھی اٹھا لائے ہیں یہ دیکھو، کالی شال میں لپٹی بے ہوش حنا اور نیم جاں مراد کو انھوں نے فرش پر ڈال دیا۔۔۔۔۔۔۔ ارے! میرے پیارو! یہ تو تم نے اب کی بار بڑا کمال کر دیا، یہ دونوں میری آنکھیں ہوں گے میرے ہاتھ بنیں گے میرے پاؤں بنیں گے۔ حنا کی اور مراد کی تربیت چنبل کی وادیوں میں ہونے لگی، ہتھیاروں سے کھیلنا، بے قابو گھوڑوں پر قابو پانا، آس پاس کے علاقوں میں بسے دولت مند لوگوں کے گھر کی خبر رکھنا، مناسب موقع پر لوٹنا، اور کسی کے ہاتھ نہ آنا، یہی اصول ان کا مذہب تھا یہی ان کا قانون تھا جس کی پابندی وہ ہمیشہ کرتے تھے، پری جمال حنا اب چاندنی بن چکی تھی سیاہ رات کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو چاندنی بن کر پھیل جاتا ہے نا؟

مراد کو سردار نے "سکندر" بنا ڈالا تھا۔ بچپن کی دھندلائی ہوئی یادوں پر ماحول کا دبیز پردہ پڑ چکا تھا، ڈاکو "چاندنی" پہاڑوں، وادیوں سے بجلی جیسے

گھوڑے پر سوار گذرتی رہتی ایک دفعہ ان ڈاکوؤں نے ایک چلتی ٹرین پر حملہ کر دیا، جس ڈبے میں چاندنی اور سکندر داخل ہوئے اس میں ایک خوب صورت سی دلہن زیورات سے لدی بیٹھی تھی اور اس کے پہلو میں ایک نوعمر لڑکا، دلہن نے چاندنی کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر روتے ہوئے کہا، مجھے مار ڈالو لیکن اس کو چھوڑ دو، دلہن نے دیور کی طرف اشارا کیا نہیں بھابی! میں جان دوں گا آپ میکے چلی جانا، دیکھو ڈاکو جی، یہ میری بھابی ہے، میری ماں نہیں ہے، بھابی ماں سمان ہوتی ہے میری ماں کو تم چھوڑ دو، میری جان لے لو، اس کے کہنے اس کا سہاگ ہیں وہ بھی چھوڑ دو ابھی تین مہینے ہی تو ہوئے ہیں بھیا کی شادی ہوکر، لڑکا رونے لگا۔

چاندنی اور سکندر کے حافظے پر پڑا وہ دبیز پردہ ذرا سا سرک گیا جہاں ان کے ماں باپ کے چہرے اب بھی واضح تھے چاندنی نے ان دونوں کو چھوڑ دیا اور دونوں بھائی بہن خالی ہاتھ اور بھرے دل سے لوٹ گئے۔

دوسرے دن "بادشاہ" نے بیٹی کو اداس دیکھ کر کہا، اے چاندنی! کیوں چپ چپ ہے تو، چاندنی کہنے لگی، بابا! مجھے بھابی چاہیے ---- بابا نے قہقہہ لگایا تو کونسی بڑی بات ہے رواج کے مطابق پسند کر لے کسی اچھی سی چھوری کو اور اس کی چادر اس پہ ڈال دے، اگر سکندر اسے ڈھونڈھ لے تو پھر بیاہ دھوم سے کر دیں گے چاندنی خوش ہوگئی۔ اپنے بچپن کی کالی شال جس پر سفید موتیوں کی بیل اس کی نانی نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی اپنے اوپر ڈالی اور چہرے پہ نقاب کس کے باندھا اور نکل پڑی اپنے گھوڑے پر، گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں وادیوں میں گونج رہی تھی جس طرح چاندنی کے کانوں میں شہنائی ----

اماوس کی کالی رات میں گلابی حویلی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی چاندنی کو محسوس ہوا کہ یہ حویلی کی مانوس فضا اسے پاس بلا رہی ہے، وہ ڈاکو تھی، ویر تھی لیکن اس وقت کمزور ہوتی جا رہی تھی، بھابی تلاش کرنا آسان کام نہ تھا، ماں ایسے ہی تو نہیں ملتی نا! ماں کو پانے کے لئے جنم لینا پڑتا ہے، اپنی دنیا چھوڑ کر نئی دنیا میں آنا پڑتا ہے، رو رو کر اپنی آمد کا اعلان کرنا پڑتا ہے، تب کہیں ممتا کے ہاتھ بڑھ کر کلیجے سے لگا لیتے ہیں ---- چاندنی نے آنکھیں بند کر لیں، اسے لگا کہ ماں کے ہاتھ اس کو تھام کر کلیجے سے لگا رہے ہوں ماں پوچھ رہی ہو، کہاں تھی بیٹی، اتنے دن ------؟!

دیواریں پھلانگتی ہوئی وہ حویلی کے اس کھلے حصے میں چلی گئی، جہاں رات کی رانی مہک رہی تھی، کئی چارپائیاں نظر آئیں، ہر ایک پر کوئی نہ کوئی سو رہا تھا۔ چاندنی آگے بڑھ کر ایک ایک کو دیکھنے لگی، مردانہ لباس پہنے سر پر شملہ باندھے منہ پر نقاب ڈالے ہوئے چاندنی حویلی کے صحن سے گذرتی جا رہی تھی۔ آخر اس کی نظر اس چہرے پر پڑ ہی گئی جس کی اسے تلاش تھی اپنے کاندھے سے شال نکال کر اس حسین تراشیدہ بالوں والے پیکر پر ڈال دی اور چپکے سے واپس ہو گئی۔ دوسرے دن سب کے سامنے چاندنی نے سکندر سے کہا بھیا! ڈھونڈھ لو اپنی بہن کو، جو میری کالی شال میں چھپی ہے، سکندر آخر اسی کا بھائی تھا-----

"ریڈولا" کے فیشن زدہ ماحول میں روبی نے ایک خوب صورت سی شال میں خود کو دیکھا تو حیران رہ گئی، ہائے ممی! یہ کتنی اچھی شال ہے؟ سب لوگ حیران تھے یہ یہاں سے آ گئی؟ نانی ماں کی پالی ہوئی ایک خادمہ نے شال دیکھتے ہی چیخ ماری، یہ تو حسنا بی بی کی شال ہے جسے ڈاکو لے گئے تھے -!!

روبی دراصل حسنا کی چچازاد بہن تھی جو اپنے ماں باپ کے ساتھ بچپن میں ہی لندن چلی گئی تھی کچھ عرصہ بعد یہ لوگ اپنے وطن واپس ہو کر یہیں بس گئے حنا کی تصویریں اس کے بھائی اور مقتول ماں باپ کی تصویریں اب بھی یہاں لگی ہوئی تھیں روبی جب بھی باہر نکلتی وہی شال اوڑھ کر نکلتی، رات کو ڈیڈی کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے باہر نکلتی روبی نے دیکھا تو دھک سے رہ گئی، دور کھڑی دو آنکھیں اُسے گھورے جا رہی تھیں، روبی گھر آگئی حسب معمول کھا پی کر سب سو گئے، صبح کے سورج نے روبی کے گم ہونے کا اعلان کیا" روبی کے ڈیڈی نے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا مگر روبی نہ ملی۔ سکندر نے روبی کو اتنی صفائی سے اڑایا تھا کہ خود روبی اس دلیری پر حیران رہ گئی۔ سکندر نے روبی سے چمبل کی وادیوں میں شادی کر لی، چاندنی بے حد خوش تھی خدا معلوم کیوں دونوں میں اتنی محبت تھی کوئی سمجھ ہی نہیں سکا" ایک دن روبی نے چاندنی سے کہا" چاندنی! یہ ڈاکوؤں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ تم اچھی زندگی کیوں جینا نہیں چاہتیں؟ روبی کے پیار بھرے انداز نے چاندنی کی آنکھوں سے تارے برسائے کمزور حافظے نے صرف حسنا اور مراد ہی نام یاد رکھے تھے جب ذکر نکلا تو روبی چلا پڑی روبی اور چاندنی چچا زاد بہنیں تھیں، مراد کو پتہ چلا تو اسکو بھی سویا ہوا ماضی انگڑائی لیتا نظر آیا" ان تینوں کے درمیان کانا پھوسی ہوتی رہی مگر چاندنی اور سکندر بادشاہ بابا کو چھوڑنے تیار نہ تھے اگر بھاگ کر جاتے تو ڈاکو یقیناً انھیں ختم کر دیتے۔۔۔۔۔

کالی شال کا سایہ تینوں کے سر پہ تھا" اندھیرے نہ بھی ہوں ایک سیاہ چادر آنکھوں پر ڈال لی جائے تو اندھیرا ہی لگتا ہے۔

چاندنی نے بابا سے کہا، بابا، میری بھی شادی کر دیجئے نا! بابا نے زور دار قہقہہ لگایا کہا پسند کر لے کسی اور سردار کے بیٹے کو! نہیں بابا، میں تو کسی شہری بابو سے شادی کروں گی جس کی بڑی سی حویلی ہو خوب سارا مال ہو، تو بیٹی تجھے پھر دوسرے ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہے گا تو مزے کی زندگی نہ جی سکے گی، بابا نے کہا، چاندنی بولی بابا! ہم مزے کی زندگی کسی کو نہیں جینے دیتے تو ہم کو زندگی کا مزہ کیوں چاہئے؟

نہیں میری بچی، ایسے نہ بول، ایسے نہ بول تو میرے دل کا ٹکڑا ہے میں تیرا دکھ نہیں سہہ سکتا بابا! جب میرے ماں باپ کا قتل تمہارے ساتھیوں نے کیا تو میں دیکھتی ہی رہ گئی کچھ نہ کر سکی اب تم بھی صبر سے دیکھ لینا ------ بابا کے تیور بدل گئے۔ کیا تو اپنے بابا سے بغاوت کر رہی ہے؟

نہیں میں اپنا حق مانگ رہی ہوں اپنے ماں باپ کو کھو کر تمہیں پایا ہے کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ کچھ مانگ سکوں؟ چنبل کی وادیوں کا بادشاہ کیا اتنی سخاوت نہیں کر سکتا کہ اپنے بچوں کے پھٹے دامن کو ہی کچھ خوشیاں دے کر سکوں کی اس میں ڈال دے؟ بابا کی آنکھیں بہنے لگیں، بہتی رہیں، دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے "بابا بادشاہ" گر گیا۔

چنبل کی وادیوں میں بہتے پانی کا شور تھا بابا کا بے جان جسم انھیں وادیوں کے دامن میں دفن کیا جا رہا تھا ---- چاندنی، سکندر اور روبی ایک ہی کالی شال میں لپٹے اپنے برق رفتار گھوڑوں کی طرف دیکھ رہے تھے ---!---!

عہدِ وفا کے بعد

گاؤں کی قدامت پسند فضا میں پروان چڑھنے کے بعد کم عمری میں ہی اعجاز کی شادی کر دی گئی۔ پرانے لوگ آپس میں رشتے طے کر لیا کرتے تھے، شادی کچھ مسئلہ نہ تھی لیکن اعجاز کے تعلیمی شوق نے گاؤں میں ٹکنے نہ دیا، اعجاز نے اڑان بھری اور پہنچے شہر میں شہر حیدرآباد پردیسیوں کے لئے ماں کی گود کی طرح ہے، یہاں کی دنیا اعجاز کو بڑی اچھی لگی سو وہ یہیں کے ہو رہے، مزید تعلیم حاصل کرتے رہے بیوی کو بھی گاؤں سے بلوالیا اور شہر ہی کے ہو گئے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی سرگرمیاں بھی جاری تھیں، ایک کالج میں بہ حیثیت لیکچرر جگہ مل گئی، کالج میں لیکچر دیتے ہوئے وہ خود اپنا "درس زندگی" بھول گئے، وہ یہ بھول گئے کہ وہ شادی شدہ اور ایک بچے کے باپ بھی ہیں۔

مہ جبین جو خود بھی لیکچرر تھی، اعجاز کے دل کو بھا گئی، ڈیوٹی کی حد تک ان کا جواب نہ تھا با اصول آدمی تھے مگر یہ نیا راستہ جس پر وہ چل پڑے تھے کافی دشوار تھا کاش (کہ محبت کا ہونا، نہ ہونا انسان کے بس میں ہوتا تو اعجاز سے یہ خطا کبھی نہ سرزد ہوتی، اور پھر یلت ایک طرفہ نہیں تھی ـــ

ے دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی ....

مہ جبین کے والد کا انتقال ہو چکا تھا بیوہ ماں کا سہارا مہ جبین ہی تھی دو چھوٹی بہنیں زیر تعلیم تھیں۔ بھائی تو تھا ہی نہیں۔ آخر ایک دن کافی زور دار پتھر بیری کے درخت پر پڑا، یعنی مہ جبین کے لئے بہت معقول رشتہ آگیا، لڑکا انجنیئر تھا، لین دین کی شرط نہیں تھی مہ جبین کی ماں بہت خوش ہو گئیں اعجاز کا بے تکلف گھر میں آنا جانا تھا مہ جبین کی ماں نے ان سے مشورہ لیا " اعجاز مہ جبین کے لئے رشتہ آیا ہے لڑکا انجنیئر ہے، خاندانی ہے مانگ بھی کچھ نہیں " اعجاز کے دل و دماغ میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے، یہ عہدِ وفا کتنی ہی مضبوط ڈور سے باندھا جائے لیکن کبھی نادانستہ طور پر وہ گرہ کھل ہی جاتی ہے جیسے ہم دونوں ہاتھوں سے مضبوط باندھتے ہیں، بہ مشکل اعجاز کے منہ سے نکلا " پہلے آپ مہ جبین سے تو پوچھ لیجئے " اور واپس چلے گئے دوسرے دن کلاس ختم ہوتے ہی حسبِ معمول نیم کے درخت کے نیچے دونوں خاموش بیٹھے تھے جیسے کہ میٹھی بولیاں بھی کڑوی ہو چلی ہوں، اعجاز نے مٹھائی کا ڈبہ مہ جبین کے آگے رکھا، اداس مہ جبین کا چہرہ سوالیہ بن گیا۔ اعجاز نے کہا کل میرے یہاں دوسری بار لڑکا ہوا ہے ....

مہ جبین کو معلوم نہیں تھا کہ اعجاز شادی شدہ ہے، مہ جبین نے لمبی سی سانس لے کر کہا " بہت بہت مبارک ہو " بہت دیر خاموشی رہی پھر مہ جبین سے اعجاز نے کہا " مجو ! بہتر ہوگا کہ تم یہ رشتہ قبول کر لو، مجو کی آنکھوں سے برسات ہونے لگی، بولی کہ اعجاز ! ایک بار پھر سوچ لو میں اب بھی تمہاری ہو سکتی ہوں اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں نئی زندگی کسی نہ کسی طرح قبول کر ہی لوں گی لیکن کیا تم میرے بغیر جی سکو گے ؟ ....

اعجاز نے آنکھوں کی نمی چھپانا چاہی مگر ناکامیوں کا آغاز ہو چکا تھا ٹوٹتے تاروں کے درمیان صرف اتنا ہی کہہ سکے "کوشش کروں گا" ....

اور مجو کی شادی کی تیاری شروع ہو گئی، زیادہ دبار اعجاز کے کاندھوں پر تھا، گھر کی سجاوٹ سے لے کر جہیز کی خریدی تک اعجاز ہی اعجاز تھے، مجو نے مانجھے کی رسم سے پہلے اعجاز سے کہا، اعجاز، اب بھی موقع ہے تم مجھے اپنا لو، امی بھی تمہیں پسند کرتی ہیں" مجو! میں تمہیں سوکن کی زندگی نہیں دے سکتا بس کیا کروں، مجھ سے غلطی ہو گئی میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا، دنیا میں تماشا کرنے سے بہتر ہے کہ غم کو گھونٹ گھونٹ کرکے پی لیا جائے میں کبھی تمہارا نام نہیں لوں گا، مگر تمہارے نام سے زندہ رہوں گا، اعجاز نے بڑے یقین سے عہد وفا کر لیا۔

مجو کی شادی ہوئی دلہن رخصت ہو گئی مہمان چلے گئے، اعجاز شامیانے کے نیچے نہ جانے کب تک تنہا بیٹھے رہے، وقت آنسوؤں میں بھیگتا رہا، رات کے اندھیرے بڑھنے لگے تو تھکے تھکے قدموں سے اعجاز گھر لوٹ آئے اس گھر میں جہاں ان کی بیوی تھی، ان کے بچے تھے مگر ان کو کسی سے دلچسپی نہیں تھی بس فرض کی حد تک نبھانا جانتے تھے۔ لکڑی یا کوئلہ جلے تو سب ہی دیکھتے ہیں مگر راکھ میں دبی چنگاریاں کسی کو نظر نہیں آتیں۔ مجو کو بھلانے کے لئے اعجاز نے کئی جتن کئے اپنی علمی مصروفیتیں بڑھالیں پھر بھی چین نہ آسکا، مجو شادی کے بعد شوہر کے ساتھ ہندوستان سے باہر جا چکی تھی ایک دن اچانک اعجاز نے اعلان کر دیا کہ وہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر بیرون ملک روزی کمائیں گے، بیوی کو اعتراض ہوا، دوستوں نے سمجھایا مگر اعجاز نہ مانے اتفاق سے انھیں دنوں مجو کی ماں کی طبیعت خراب ہوئی مجو شادی کے بعد

پہلی بار ہندوستان آئی تو اعجاز سے ملنے ان کے گھر بھی آ گئی، اعجاز میں ایک سال کے اندر کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں، آتش غم سے دہکتا ہوا چہرہ اوروں کے لئے اتنا رعب دار ہو چلا تھا کہ گھر والے بھی ان سے کم ہی بات کرتے، کسی نے ان کو نرم لہجے میں بات کرتے یا مسکراتے مدت سے نہیں دیکھا تھا آخر مجو نے پوچھ ہی لیا" اعجاز، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے ؟ " اچھا ہوں" اعجاز کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ تم وطن چھوڑ کر کیوں جانا چاہتے ہو؟ تم یہ شہر کیوں چھوڑنا چاہتے ہو جو ہماری محبت کا گواہ ہے ؟ اسی شہر کی مٹی سے تو میں بنی ہوں، تم کیا مجھے چھوڑ جاؤ گے ؟ اعجاز کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا......

چند سال اسی طرح گذر گئے، شہر کے چھوٹے چھوٹے مکان بڑی بلند عمارتوں میں ڈھل گئے، میدانوں میں بازار بنا دیے گئے بے شمار تبدیلیوں کے بعد بھی جو نہ بدلا تو وہ اعجاز کا دل تھا وہی مجو کی یادوں سے آباد شہر، آخر ایک دن اعجاز گھر لوٹ کر نہیں آئے بہت تلاش کے بعد بھی پتہ نہ چلا گھر والوں کا روتے روتے برا حال ہو گیا مگر اعجاز کسی کو بھی کہیں پھر نظر نہیں آئے۔

اعجاز کی ایک شاگرد فوزیہ کسی بزرگ کے مزار پہ گئی واپسی میں سیڑھیوں پہ فقیروں کی قطار دست طلب پھیلائے کھڑی تھی فوزیہ خیرات کرتی جا رہی تھی لیکن ایک جگہ اس کا ہاتھ رک گیا، بادشاہوں کا غرور آنکھوں میں لیے لمبی لمبی زلفیں کاندھے پہ بکھرائے میلے، بوسیدہ کپڑوں میں ایک فقیر شان بے نیازی سے خلا میں دیکھ رہا تھا، شاید کوئی شبیہ اس کے تصور میں ہو فوزیہ نے اسے مخاطب کیا مگر جواب نہیں ملا، قریب بیٹھے دوسرے فقیر نے کہا، جو کچھ ہے سامنے رکھ دو یہ جو

تھوڑا سہی نا اسی میں ڈال دو انھیں جب بھوک لگتی ہے تو کھا لیتے ہیں پیسوں کو ہاتھ نہیں لگاتے، یہ کسی سے بات بھی نہیں کرتے بالکل خاموش رہتے ہیں، فوزیہ نے اعجاز صاحب کو پہلی بار ایسے دیکھا جیسے وہ کوئی دیوتا ہو، وہ طالب علمی کے زمانے میں ان سے ڈرتی تھی مگر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس بادشاہ کے آگے سر جھکا دے، اپنے دیوتا کے قدموں میں بیٹھ جائے جس سے اس نے علم سیکھا سب کچھ سیکھا، سب ہی کچھ پایا، وہ آج اسے عطا کرنے والا بھکاریوں کے صف میں بیٹھا فوزیہ کا امتحان لے رہا تھا فوزیہ حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی ....

زخمِ دل

موسم سرما کی رات کہتے ہیں کہ بہت لمبی ہوتی ہے سانپ کی طرح، اس کے باوجود دل چاہتا ہے کہ سوتے ہی رہیں، گرمی کی راتیں مختصر ہونے کے باوجود گذاری نہیں جاتیں ذرا آنکھ لگتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ پل بھر میں صبح ہو گئی۔ گرمی اور سردی کے درمیان بھی ایک موسم ہوتا ہے وقت پر سونا وقت پر اٹھنا خود بخود انسان مجبور ہوتا ہے۔ اس موسم کا نام ہے۔ "ذمہ داری" ذمہ داری کا موسم بڑا شدید ہوتا ہے تکلیف و آرام کے احساس سے بے خبر رکھتے ہوئے بنی آدم کو اپنے فرائض کی تکمیل میں لگا دیتا ہے اس موسم کی راتوں کے خواب بڑے ادھورے ہوتے ہیں روشن حقیقتوں کا سامنا یہ خواب نہیں کر سکتے یہ جاگتی ہوئی آنکھوں میں بس یونہی چلے آتے ہیں ان کی نہ تکمیل ہوتی ہے نہ تعبیر۔

اسی طرح کے موسم سے فوزیہ گذر رہی تھی خواب اس کی آنکھوں میں آتے ہی الٹے پاؤں لوٹ جاتے آرزوں کے شبستاں ویران ہو جاتے، فوزیہ بس ایک مشینی زندگی گذار رہی تھی زندگی کی اہم ضرورتوں کی تکمیل میں سرِ فہرست جو نام ہے وہ عورت کا نام ہے، چاہے وہ کسی بھی روپ میں ہو، ماں، بیوی

بہن، بیٹی، بھابی، بہو، محبوبہ، دوست، نرس ڈاکٹر، آیا، پڑوسن خادمہ وغیرہ اسی مجموعہ کا نام فوزیہ تھا' ہاں ! فوزیہ ! روایتی رشتوں کی خاردار جھاڑیوں میں اُلجھی کسی بوسیدہ دامن کی طرح ہونے کے باوجود وہ اس قدر مضبوط اور حوصلہ مند تھی کہ دیکھنے والے عش عش کرتے رہتے گھر کی تمام 'ذمہ داریاں' اور سارے رشتوں سے انصاف کرنے کا ہنر خوب جانتی تھی فوزیہ نے حالات کا مقابلہ کرتے رہنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ہر سختی پہ مسکراتی اور اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتی ہر ایک سے اچھی توقع وابستہ رکھتی گئی ناکامیوں کے باوجود آس بندھی رہتی کہ کبھی تو اس کے زخم مندمل ہوں گے۔ ٹوٹے ہوئے آئینوں سے زخمی ہوتے کے باوجود ان ٹکڑوں میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کرتی روایتی رشتوں کے نقاب میں چھپی ہوئی عورت کو وہ بے نقاب کرنا چاہتی تھی دنیا کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ عورت عورت ہی ہوتی ہے ممتا اور محبت سے لبریز ایک ساغر، کلیوں کے چٹکنے کا خوشبودار لمحہ، حیات انساں کی وہ کہکشاں جس سے زندگی کے سب تاریک لمحے جگمگا جاتے ہیں۔

محبت سچ مچ اندھی ہوتی ہے اگر اندھی نہ ہوتی تو فوزیہ کبھی دیکھ ہی لیتی کہ شاہ نواز کی نگہہِ التفات آج کل سعدیہ کے چہرے کا طواف کرتی رہتی ہے شاہ نواز پر فوزیہ کو بہت بھروسہ تھا۔ عمر رسیدہ پرانی خادمہ نے کئی بار اشارتاً کچھ کہنے کی کوشش کی مگر مایوسی ہوئی کیوں کہ فوزیہ تو بڑی سے بڑی بات بھی مذاق میں اڑا دیتی لیکن ایک بار صرف ایک بار بالکل پہلی

دفعہ کوئی پھانس فوزیہ کے دل میں چبھ گئی۔ سعدیہ آج سولہ سنگھار کئے ہوئے کمرے میں آگئی جہاں دوپہر کے کھانے کے بعد فوزیہ اور شاہ نواز آرام سے ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے سعدیہ کا سلام دالا ہاتھ فوزیہ کے لئے کم اور شاہ نواز کے لئے زیادہ اٹھا اور بے تکلف شاہ نواز کے آستین تک پہنچ گیا۔ نواز بھائی میں کیمرہ لے کر آئی ہوں آپ ذرا میری تصویریں لے لیجئے نا! پلیز ......

سعدیہ کا بے تکلفانہ انداز اور شاہ نواز کا بے ساختہ اٹھ جانا معلوم نہیں کیوں اس فراخ دل فوزیہ کے دل میں چبھ گیا، سعدیہ دور کے رشتے میں شاہ نواز کی بہن ہوتی تھی عمر زیادہ ہونے کی وجہ اور نامناسب ناک نقشہ کی وجہ ابھی تک کنواری ہی تھی۔ اکثر شاہ نواز کے گھر آنا جانا رہتا نہ صرف آنا جانا بلکہ ہفتوں قیام بھی رہتا اور اسی دوران فوزیہ کی نندیں پکنک کے کئی پروگرام بناتیں جس میں فوزیہ بھی شریک رہتی لیکن خادمہ کی حیثیت سے۔ فوزیہ تو ہمیں ذمہ داریوں کے موسم کی پیداوار تھی کسی نے اس کو مجبور تھوڑا ہی کیا تھا اس نے خود بخود اپنے بوجھ بڑھا لئے تھے خاندان کی دو تین معذور و ضعیف خواتین جن کے اولاد تھیں اور شوہروں کے بعد حالات کا شکار ہو کر دائم المریض و فریش ہو چکی تھیں فوزیہ نے ساس نندوں کی مخالفت مول لے کر ان کو اپنے گھر میں بسا لیا تھا کامیاب و ماہر نرس کی طرح ان کی دیکھ بھال کرتی ساس، سسر، نندوں، دیوروں کی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے شوہر کی تمام ذمہ داریاں بحسن و خوبی نبھاتی بچوں کے فرائض اور میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے کبھی تغافل نہ کرتی جیسے وہ خود "ماں حوّا" ہو شہر سے دور قائم کئے گئے پارک کا پروگرام طے ہو چکا تھا

صبح کا ناشتہ وہیں کرنا تھا پکوان ختم کر کے سب لوگ تیار ہو کر صبح صبح بڑی سی گاڑی
یں بھر کر پارک کی طرف چل پڑے راستے میں جنگل جیسا ماحول شروع ہوا تو گیتوں
ا سلسلہ شروع ہوا سب لڑکیاں، عورتیں گائی جارہی تھیں۔

"بن کے پنچھی گائے پیار کا ترانہ .....

مل جائے اگر آج کوئی ساتھی مستانہ .....

ساتھی مستانہ ......

پر سعدیہ شاہ نواز کو دیکھ کر ہنس پڑی شاد نواز شائد عادتاً مسکرا پڑے فوزیہ بھی ہنس
دی شبنم سے تر پھولوں والی ہنسی ....

منزل مقصود پر پہنچ کر سب گاڑی سے اتر کر سامان نکالنے میں لگ گئے۔
شطرنجیاں بچھیں، برتن نکلے، ناشتہ سجا، اور پھولوں کے کنج کے درمیان
ناشتہ کیا گیا اس کے بعد سب اپنے اپنے حساب سے آس پاس گھومنے نکل گئے
فوزیہ اپنے چھوٹے بچوں کو گھما پھرا کر لے آئی اور سامان کی جگہ بیٹھ کر خادمہ سے
باتوں میں لگ گئی دوپہر سے سہ پہر ہوئی لنچ یاد آیا سب دوبارہ دسترخوان بچھا
کر کھانے بیٹھ گئے مگر شاہ نواز اور سعدیہ دکھائی نہیں دئے۔ فوزیہ دل میں پریشان
تھی مگر کسی سے پوچھ نہ سکی کہ اس کے "نامدار" آخر گئے کہاں؟ شام آسمان کے زینوں
سے اتر کر زمین پہ اُترنے لگی پرندے شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو اپنے آشیانوں
کی طرف بُلانے لگے، افق کی آنکھیں مخمور ہو چلیں سامان باندھا گیا واپسی کی تیاری
ہو گئی لیکن شاہ نواز اور سعدیہ ابھی تک نہیں آئے سب حیران تھے کیوں کہ سب
کھیل کود کی دلچسپیوں میں رہ گئے تھے۔ ان کا خیال کسی کو نہ رہا اب سب ہی

فکرمند دکھائی دے رہے تھے شام کا رنگ "دو آتشہ" ہو چلا تھا پارک کے انتظامیہ نے سیٹیاں بجانی شروع کیں کہیں سے شاہ نواز آ کر کار میں بیٹھ گئے سعدیہ سامنے سے تھکی تھکی چلی آ رہی تھی کسی نے کچھ بھی نہیں پوچھا سب لوگ گھر واپس ہو گئے گھر میں آتے ہی فوزیہ کا پریشان چہرہ دیکھ کر سعدیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "واہ بھابی کی صورت تو دیکھو، نواز بھائی کے بغیر پکنک میں غالباً کچھ مزا نہیں آیا؟ سعدیہ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے پکنک کا لطف سارا اس کو حاصل رہا ہو اور پھر بے ساختہ ہنسی........ فوزیہ کا زور دار طمانچہ سعدیہ کے منہ پر پڑا" گھر والوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے فوزیہ عورت تھی ایک مکمل عورت، جو اپنے شوہر کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے، جس کی حفاظت بھی کرنا جانتی ہے چوری کی نیت سے دیکھنے والی نگاہ کو بھانپ جاتی ہے نواز نے آ کر فوزیہ کا ہاتھ تھام لیا جو دوسرے طمانچہ کی تیاری میں اٹھنے ہی والا تھا" فوزیہ کا دوسرا ہاتھ نواز کے گریباں کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا اس زور سے فوزیہ نے نواز کے گریبان کو جھنجوڑا کہ کئی بٹن ٹوٹ گئے فوزیہ چلا پڑی بتایئے آپ کہاں تھے؟ پارک میں آپ ہم سب کے ساتھ نہیں تھے" آپ دونوں ساتھ تھے یا نہیں؟ فوزیہ کے جواب کے جواب میں نواز کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں احساس جرم انھیں اب ہوا جب ان کی بیوی فوزیہ مکمل عورت بن گئی اپنے آپ کو شوہر کی ذات میں ضم کرنے والی ایک ہی ذات ہوئی نا؟ آج احساس ندامت نے نواز کو اپنی بیوی کی ذات میں گم کر دیا تھا خاموشی کی فضا تھی اس کے باوجود نواز کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں فوزیہ اور نواز کی ذات ایک ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ سعدیہ کی ذات بالکل الگ تھی قطعاً الگ...

سعدیہ کی ذات پر رسوائی کے گہرے داغ ابھر آئے تھے گھر والوں سے آنکھ ملائے بغیر سعدیہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ رات کو شرمسار نواز اپنی جرأت مند بیوی پر فخر محسوس کر رہے تھے اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یقیناً خاندان تباہ ہو جاتا۔ مرد کو ہار ماننا آتا ہی نہیں، مرد کا احساس شرمندگی بے معنی ہے وہ صرف وقتی طور پر شرمسار ہوتا ہے جرم کا اقرار کرتا ہے معافی کا طلب گار ہوتا ہے لیکن ترکِ گناہ؟ ترکِ گناہ مرد کے نزدیک گناہ سے کہیں بدتر ہے۔ عورت ہر روپ میں عورت ہے مکمل عورت ہے۔ زخمی دل کے باوجود بھی سانس بڑے وقار سے لیتی ہے عورت کی ہر نظر پیغامِ زندگی ہے عورت کا وجود بہر حال میں روشن ہے زخمِ دل کے باوجود بھی یہ زندگی کے نشیب و فراز سے لڑ کھڑائے بنا گذرتی ہے چند ہی روز میں فوزیہ کی کوششیں کامیاب ہوئیں ایک معقول رشتہ اس نے سعدیہ کے لئے ڈھونڈھ لیا اور نواز پر دباؤ ڈالا کہ سعدیہ خاندان کی لڑکی ہے اس کی شادی ہم ہی کو کرنا ہے نواز کا منہ بند تھا سر جھکائے اطاعت گذار نہ ہونے کی سعدیہ کو انکار کی گنجائش نہیں تھی ایک ریٹائرڈ آفیسر فضل خان سے اس کی شادی ہونے جا رہی تھی جس کے پاس عزت و دولت کی کمی نہیں تھی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی سابق ذمہ دار آفیسر پر اب کوئی ذمہ داری نہیں تھی گھر سنبھالنے کے لئے شریکِ حیات کی تلاش پوری ہو چکی تھی سعدیہ فضل خان کا نکاح فوزیہ نے اپنے ہی گھر میں طئے کر رکھا تھا وہیں سے سعدیہ کو رخصت کیا اب اسی طرح سعدیہ کے بدنامیوں کے زخم مندمل ہو گئے نواز کا احساسِ شرمندگی کا ذرا سا گھاؤ بھر گیا لیکن فوزیہ کا "زخمِ دل" ہرا ہی رہ گیا..........

دفعہ کوئی پھانس فوزیہ کے دل میں چبھ گئی ۔ سعدیہ آج سولہ سنگھار کئے سیدھے کمرے میں آ گئی جہاں دوپہر کے کھانے کے بعد فوزیہ اور شاہ نواز آرام سے ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے سعدیہ کا سلام والا ہاتھ فوزیہ کے لئے کم اور شاہ نواز کے لئے زیادہ اٹھا اور بے تکلف شاہ نواز کے آستین تک پہنچ گیا ۔ نواز بھائی میں کیمرہ لے کر آئی ہوں آپ ذرا میری تصویریں لے لیجئے نا ! پلیز ......

سعدیہ کا بے تکلف انداز اور شاہ نواز کا بے ساختہ اٹھ جانا معلوم نہیں کیوں اس فراخ دل فوزیہ کے دل میں چبھ گیا ، سعدیہ دور کے رشتے میں شاہ نواز کی بہن ہوتی تھی عمر زیادہ ہونے کی وجہ اور نامناسب ناک نقشہ کی وجہ ابھی تک کنواری ہی تھی ۔ اکثر شاہ نواز کے گھر آنا جانا رہتا نہ صرف آنا جانا بلکہ ہفتوں قیام بھی رہتا اور اسی دوران فوزیہ کی نندیں پکنک کے کئی پروگرام بنا لیتیں جس میں فوزیہ بھی شریک رہتی لیکن خادمہ کی حیثیت سے ... فوزیہ تو یوں ذمہ داریوں کے موسم کی پیداوار تھی کسی نے اس کو مجبور تھوڑا ہی کیا تھا اس نے خود بخود اپنے بوجھ بڑھا لئے تھے خاندان کی دو تین معذور و ضعیف خواتین جو بے اولاد تھیں اور شوہروں کے بعد حالات کا شکار ہو کر دائم المریض و پریشان ہو چکی تھیں فوزیہ نے ساس نندوں کی مخالفت مول لے کر ان کو اپنے گھر میں بلا لیا تھا کامیاب و ماہر نرس کی طرح ان کی دیکھ بھال کرتی ساس، سسر، نندوں، دیوروں کی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے شوہر کی تمام ذمہ داریاں بحسن و خوبی نبھاتی بچوں کے فرائض اور میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے کبھی تغافل نہ کرتی جیسے وہ خود "ماں حوا" ہو ۔ شہر سے دور قائم کئے گئے پارک کا پروگرام طے ہو چکا تھا

صبح کا ناشتہ وہیں کرنا تھا پکوان ختم کر کے سب لوگ تیار ہو کر صبح صبح بڑی سی گاڑی
میں بھر کر پارک کی طرف چل پڑے راستے میں جنگل جیسا ماحول شروع ہوا تو گیتوں
کا سلسلہ شروع ہوا سب لڑکیاں، عورتیں گاتی جارہی تھیں۔

"بن کے پنچھی گائے پیار کا ترانہ .....
مل جائے اگر آج کوئی ساتھی مستانہ .....

ساتھی مستانہ ......

پر سعدیہ شاہ نواز کو دیکھ کر ہنس پڑی شاہ نواز حسبِ عادت مسکرا پڑے فوزیہ بھی ہنس
دی شبنم سے تر پھولوں والی ہنسی ....

منزلِ مقصود پر پہنچ کر سب گاڑی سے اتر کر سامان نکالنے میں لگ گئے۔
شطرنجیاں بچھیں، برتن نکلے، ناشتہ سجا، اور پھولوں کے کنج کے درمیان
ناشتہ کیا گیا اس کے بعد سب اپنے اپنے حساب سے آس پاس گھومنے نکل گئے
فوزیہ اپنے چھوٹے بچوں کو گھما پھرا کر لے آئی اور سامان کی جگہ بیٹھ کر خادمہ سے
باتوں میں لگ گئی دوپہر سے سہ پہر ہوئی لنچ یاد آیا سب دوبارہ دسترخوان بچھا
کر کھانے بیٹھ گئے مگر شاہ نواز اور سعدیہ دکھائی نہیں دئے۔ فوزیہ دل میں پریشان
تھی مگر کسی سے پوچھ نہ سکی کہ اس کے "نامدار" آخر گئے کہاں؟ شام آسمان کے زینوں
سے اتر کر زمین پہ اترنے لگی پرندے شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو اپنے آشیانوں
کی طرف بلانے لگے، افق کی آنکھیں مخمور ہو چلیں سامان باندھا گیا واپسی کی تیاری
ہوگئی لیکن شاہ نواز اور سعدیہ ابھی تک نہیں آئے سب حیران تھے کیوں کہ سب
کھیل کود کی دلچسپیوں میں رہ گئے تھے۔ ان کا خیال کسی کو نہ رہا اب سب ہی

فکر مند دکھائی دے رہے تھے شام کا رنگ "دو آتشہ" ہو چلا تھا پارک کے انتظامیہ نے سیٹیاں بجانی شروع کیں کہیں سے شاہ نواز آکر کار میں بیٹھ گئے سعدیہ سامنے سے تھکی تھکی چلی آرہی تھی کسی نے کچھ بھی نہیں پوچھا سب لوگ گھر واپس ہو گئے گھر میں آتے ہی فوزیہ کا پریشان چہرہ دیکھ کر سعدیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "واہ بھائی کی صورت تو دیکھو، نواز بھائی کے بغیر پکنک میں غالباً کچھ مزا نہیں آیا؟ سعدیہ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے پکنک کا لطف سارا اس کو حاصل رہا ہو اور پھر بے ساختہ ہنسی........ فوزیہ کا زوردار طمانچہ سعدیہ کے منہ پر پڑا، گھر والوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے فوزیہ عورت تھی ایک مکمل عورت، جو اپنے شوہر کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے، جس کی حفاظت بھی کرنا جانتی ہے چوری کی نیت سے دیکھنے والی نگاہ کو بھانپ جاتی ہے نواز نے آکر فوزیہ کا ہاتھ تھام لیا جو دوسرے طمانچہ کی تیاری میں اٹھنے ہی والا تھا، فوزیہ کا دوسرا ہاتھ نواز کے گریباں کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا اس زور سے فوزیہ نے نواز کے گریبان کو جھنجوڑا کہ کئی بٹن ٹوٹ گئے فوزیہ چلا پڑی بتایئے آپ کہاں تھے؟ پارک میں آپ ہم سب کے ساتھ نہیں تھے، آپ دونوں ساتھ تھے یا نہیں؟ فوزیہ کے جواب کے جواب میں نواز کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں احساس جرم انھیں اب ہوا جب ان کی بیوی فوزیہ مکمل عورت بن گئی اپنے آپ کو شوہر کی ذات میں ضم کرنے والی ایک ہی ذات ہوئی نا؟ آج احساس ندامت نے نواز کو اپنی بیوی کی ذات میں گم کر دیا تھا خاموشی کی فضا تھی اس کے باوجود نواز کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں فوزیہ اور نواز کی ذات ایک ہونے کا اعلان کر رہی تھی ۔ سعدیہ کی ذات بالکل الگ تھی قطعاً الگ...

سعدیہ کی ذات پر رسوائی کے گہرے داغ ابھر آئے تھے گھر والوں سے آنکھ ملائے بغیر سعدیہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ رات کو شرمسار نواز اپنی جرأت مند بیوی پر فخر محسوس کر رہے تھے اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یقیناً خاندان تباہ ہو جاتا۔ مرد کو ہار ماننا آتا ہی نہیں، مرد کا احساس شرمندگی بے معنی ہے وہ صرف وقتی طور پر شرمسار ہوتا ہے جرم کا اقرار کرتا ہے معافی کا طلب گار ہوتا ہے لیکن ترکِ گناہ؟ ترکِ گناہ مرد کے نزدیک گناہ سے بھی بدتر ہے۔ عورت ہر روپ میں عورت ہے مکمل عورت ہے۔ زخمی دل کے باوجود ہر سانس بڑے وقار سے لیتی ہے عورت کی ہر نظر پیغامِ زندگی ہے عورت کا وجود بہر حال میں روشن ہے زخمِ دل کے باوجود بھی یہ زندگی کے نشیب و فراز سے لڑ کھڑائے بنا گذرتی ہے چند ہی روز میں فوزیہ کی کوششیں کامیاب ہوئیں ایک معقول رشتہ اس نے سعدیہ کے لئے ڈھونڈھ لیا اور نواز پر دباؤ ڈالا کہ سعدیہ خاندان کی لڑکی ہے اس کی شادی ہم ہی کو کرنی ہے نواز کا منہ بند تھا سر جھکائے اطاعت گذار شوہر بن گئے سعدیہ کو انکار کی گنجائش نہیں تھی ایک ریٹائرڈ آفیسر فضل خان سے اس کی شادی ہونے جا رہی تھی جس کے پاس عزت و دولت کی کمی نہیں تھی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی سابق ذمہ دار آفیسر پر اب کوئی ذمہ داری نہیں تھی گھر سنبھالنے کے لئے شریکِ حیات کی تلاش پوری ہو چکی تھی سعدیہ سے فضل خان کا نکاح فوزیہ نے اپنے ہی گھر میں طئے کر رکھا تھا وہیں سے سعدیہ کو رخصت کیا گیا اسی طرح سعدیہ کے بدنامیوں کے زخم مندمل ہو گئے نواز کا احساسِ شرمندگی کا ذرا سا گھاؤ بھر گیا لیکن فوزیہ کا "زخمِ دل" ہرا ہی رہ گیا.........

بات اتنی سی تھی ......

موسم سرما کی رات دانت بجا بجا کر آگے بڑھ رہی تھی سرد راتوں میں یوں بھی سناٹا بہت زیادہ ہوتا ہے میں اپنے کمرے میں ابن صفی کے جاسوسی ناول کا آخری صفحہ ختم کرنے کے بعد لائٹ بند کرکے بستر پر دراز ہو گئی میرے سیدھے جانب میرے دونوں بچے آرام کی نیند سو رہے تھے میرے سرتاج دوستوں کے ساتھ کسی دعوت میں گئے ہوئے تھے اس وقت رات کے دس بجے تھے دالان میں سناٹا تھا آگے والے کمرے میں میری ساس اور دادی ساس بیاہی نندیں سویا کرتی تھیں پیچھے والے چھوٹے دالان میں میرے خسر صاحب آدھی رات تک مطالعہ کے بعد سویا کرتے تھے داہنی بازو دو کمرے اور تھے جس میں میری ایک اور نند اور سب سے چھوٹا دیور، اور بازو کے کمرے میں منجھلے دیور کی رہائش تھی، غرض کہ اتنے بڑے گھر میں ہم سب یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے کہ محاذ جنگ پر مختلف زاویوں سے فوجی اپنے وطن کی حفاظت کے لئے خندقوں، جھاڑیوں اور مختلف گڑھوں میں چھپے رہتے ہیں، خیر تو میں اپنے بستر پہ دراز ہو گئی

اور مجھ پر نیند طاری ہونے لگی۔ کھٹ ! کھٹ ! میں نے آنکھیں کھولدیں جیسے کوئی دالان میں سوٹ بوٹ پہن کر ٹہل رہا ہو، جیسے کہ شوز ابھی ابھی شوروم سے خریدے ہوئے ہوں میرا تصوّر مجسّم ہونے لگا، پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے ایک ہاتھ میں سگار دبائے کوئی دالان میں چہل قدمی کر رہا تھا میں نے سوچا اتنی سردی میں یہ کون ٹہل رہا ہوگا۔؟ خیال ہوا کہ یہ ضرور وہ مجرم ہے جس کی ابنِ صفی کے ہیرو "فریدی" کو تلاش ہے۔ وہ آخر ٹہل ٹہل کر سوچ رہا ہوگا کہ پہلے کس کا گلا گھونٹ جائے اور کس طرح میری الماری میں رکھی بھاری رقم اور میرے خوب صورت قیمتی زیور نکال لے جائے... کھٹ... ! کھٹ... ! وہ برابر ٹہلے جا رہا تھا مسلسل اس کے جوتوں کی آواز آ رہی تھی دانت بجاتی ہوئی سردی نے جسم میں خوف کی کچھ ایسی لہر دوڑائی کہ میں عرق عرق ہوگئی اور اپنے وقتوں کی وہ تمام تدبیریں بھول گئی جو ابنِ صفی کے ہیرو فریدی نے آزمائی تھی۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ...... میں آیت الکرسی آیتِ کریمہ، اور سورہ فاتحہ کو ملا کر بوکھلاہٹ میں غلط سلط پڑھنے لگی۔ (آواز سے نہیں دل ہی دل میں) کھٹ ! ... کھٹ.... خدا جانے یہ "منوکی" کہاں مر گیا ؟ میں نے دل ہی دل میں سوچا بیچارے کتّے کو بھی شاید سردی میں جیسے آج ہی نیند آئی تھی ... کھٹ... کھٹ... ! چہل قدمی جاری

تھی میں نے ان تمام وظائف کو یاد کرنے کی ناکام کوشش کی جو بچپن میں ہر برے وقت پر پڑھنے کے لئے مجھے یاد دلائے گئے تھے مگر اسی "کھٹ کھٹ" نے دماغ پر وہ ہتھوڑے برسائے کہ استادوں کی ساری محنت پہ پانی پھر گیا نہ جانے آج بابا یعنی میرے خسر کیوں جلدی سو گئے روز تو راتوں میں جاگا کرتے ہیں خیال آیا کہ گلبرگہ والی خالہ اماں میری اماں سے کہا کرتی تھیں جب چور چوری کرنے کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو منتر پڑھتا ہے جس سے گھر والے چین سے سوئے رہتے ہیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چپ چاپ چلا جاتا ہے وہ منتر اگر کسی پر اثر نہ کرے اور چور کو پکڑنے کی کوشش کی جائے تو چور قتل کر کے بھاگ جاتا ہے" یارب ! میرے گناہ معاف کر۔ یااللہ ! میرے بچوں اور گھر والوں کی حفاظت کریں اللہ میاں کو منانے لگی "کھٹ کھٹ" مگر جاری تھی۔ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد میرے سرتاج کی مخصوص دستک سنائی دی میں بجلی کی طرح لحاف سے نکل کر کمرے کے پچھلے دروازے سے دوڑ کر نکلی باہر کا دروازہ لمحہ بھر میں کھول کر اپنے سرد ہاتھ سرتاج کے منہ پر سختی سے جمائے بہت آہستہ کانپتے لہجے میں کہنے لگی کہ "آواز نہ کیجئے گھر میں چور ٹہل رہا ہے" چور ٹہل رہا ہے" ؟ سرتاج نے حیرانی سے پوچھا "میں نے اشارے سے انھیں چپ کیا میں تھر تھر کانپ رہی تھی وہ مجھے سنبھال کر کمرے میں لے آئے دروازہ اندر سے بند کیا باقاعدہ پوچھ تاچھ کرنے لگے میں سرگوشیوں میں انھیں بتاتی گئی کہ سوٹ پہنے ہاتھ میں سگار دبائے قیمتی انگوٹھی والا چور دو گھنٹے

سے دالان میں ٹہل رہا ہے سرتاج کو ہنسی آگئی اور وہ دالان میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھنے لگے میں نے انھیں باز رکھنے کی کوشش کی تو دھڑام سے مسہری پر سے نیچے گر پڑی، سرگوشیوں میں میری التجا جاری تھی "خدارا آپ اُدھر نہ جھانکیں ورنہ وہ چور ادھر آجائے گا" میں نے انھیں غور سے آواز کی طرف دھیان دلوایا کھٹ ...... کھٹ ...... ! اب ذرا میرے سرتاج بھی کھٹ کھٹ پر چونکے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چور چوری کرنے آیا ہے یا ہمارے دالان میں چہل قدمی کرنے ؟ میری حالت پر سرتاج کو پریشانی بھی ہو رہی تھی بہر حال انھوں نے آہستہ سے بند دروازے کی چٹخنی گرائی اور دروازے سے باہر دیکھا مجھے ذرا ہمت سی ہوئی تو میں بھی جھک کر دیکھنے لگی کھٹ ...... کھٹ .. آواز ٹہل رہی تھی نظر کچھ نہیں آرہا تھا میرا تصور بھی کہیں کھو گیا تھا میرے سرتاج باہر نکلے میں نے ان کا دامن پیچھے سے پکڑ لیا مگر میرے سرتاج نے یوں جھٹک دیا جیسے ان کا دامن " دامنِ یوسف ہو " ...

اور باہر دالان میں آگئے میں بھی باہر آگئی دبے پاؤں ہم دونوں بڑے دالان میں تنہا اندھیرے میں کھڑے تھے ۔ کھٹ ! کھٹ کی آواز بدستور آرہی تھی لیکن ٹہلنے والا ندارد تھا ابنِ صفی کے ہیرو "فریدی" کی سکریٹری کی طرح میں ہمت کر کے میری ساس کے کمرے کی طرف گئی اندر بالکل اندھیرا تھا مگر گہری گہری سانسوں کی آواز آرہی تھی کمرے کا نائٹ بلب بھی روشن نہیں تھا میرے پیچھے سے میرے سرتاج نے ہاتھ آگے بڑھا کر اندازے سے لائٹ کا سوئچ آن کر دیا

بس اس کے ساتھ ہی کئی بھیانک چیخیں سنائی دیں جن میں میری بھی چیخ شامل تھی مجھے تو میرے سرتاج نے تھام لیا لیکن جو نظارا آنکھوں کے سامنے تھا وہ میں آج تک نہ بھلا سکی میری ساس کا جوڑا کھلا ہوا بال بکھرے ہوئے ان کی پیاری پیاری آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئیں، میری دونوں نندیں ایک کونے میں پریشان حال بیٹھی ڈری سہمی بیٹھی تھیں لائٹ آن ہوتے ہی ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور ان چیخوں کے ساتھ ہی میرے سسر دیور سب ہی جاگ اٹھے اور تھا اور آواز سے معلوم ہوا ہمارا پالتو کتا بھی زوردار آوازیں نکالنے لگا آخر میرے سرتاج نے ماجرا پوچھا تو ساس نندوں نے بھی وہی بتایا جو میں نے کہا تھا کھٹ کھٹ کی آواز وہ سب ہی سمجھ کر لرزاں تھیں کہ چور ٹہل رہا ہے میرے سرتاج نے خوب ہنسی اڑائی بہت دیر تک میرا مذاق اڑاتے رہے اسی دوران پھر کھٹ کھٹ سنائی دی تو سب یکدم چپ ہوگئے سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آواز کیسی ہے؟ میں نے معلومات میں یوں اضافہ کیا کہ "کوئی روح بھٹک رہی ہے شاید وہی ٹہل رہی ہے" میرے سرتاج نے مجھے بڑی غصیلی نظروں سے گھورا مگر اسی وقت مجھے ان کے غصے کی نہیں اس کی بھٹکی ہوئی روح کی چہل قدمی کی فکر تھی خیر! میرے سرتاج ابھی غور ہی کر رہے تھے کہ ان کے قریب بالکل قریب پھر "کھٹ کھٹ" سنائی دی میری ساس کی تجربہ کار نگاہیں معاملہ سمجھ گئیں سامنے دروازے کی دہلیز پر ایک "ھک" لگا تھا جسے "اسٹاپر" کہتے ہیں اس کے نیچے ایک

پھولوں کی بیل کا چھوٹا سا خشک پتہ تھا جو ہوا سے ہل رہا تھا وہ جب بھی ہوا سے ہلتا یہ "ٹک" بھی ہل جاتا اسی طرح "کھٹ کھٹ" کی آواز پیدا ہورہی تھی جسے میں نے اپنی تصوراتی آنکھ سے "مجسّم چور سوٹ بوٹ والا" سمجھ کر دیکھا اور بعد میں رائے بدل ڈالی کہ یہ بھٹکی ہوئی کسی روح کی چہل قدمی ہی ہوگی بہر حال کئی روز تک اس واقعہ کو یاد کر کے میرے سرتاج میری اور اپنی بہنوں کی ہنسی اڑاتے رہے لیکن خوف کے وہ لمحے میں نہیں بھول سکتی کبھی نہیں بھول سکتی بات دراصل یہ بھی تھی کہ اسی طرح کے گمان عموماً اندھیرے میں اکثر لوگوں کو ہوتے ہیں اور جو اندھیروں سے ڈرتے ہیں وہ لوگ اُجالوں کی اہمیت خوب سمجھتے ہیں بہرحال ؎

بات کچھ بھی نہ تھی بات اتنی سی تھی.....

شناخت

جینے کے ڈھنگ مختلف ہونے کے باوجود بظاہر سب ہی لوگ ایک جیسے ہوتے ہیں، وہی آنکھ، ناک وہی ہاتھ پاؤں مگر اس کے باوجود کوئی کسی سے نہیں ملتا ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور یہ شخصی انفرادیت کہیں کسی دل میں آرزو بن جاتی ہے جو کامیابیوں اور ناکامیوں کی منزل سے گزرتی رہتی ہے، اگر اتفاق سے ہمارے ذوق نظر کے مرکز کی طرح کوئی نظر آجائے تو ہم چونک جاتے ہیں، ہم اپنی آرزو کی شبیہہ کو دوسرے میں دیکھتے ہیں اور پہلی آرزو سے اسے منسوب کرتے ہوئے اس کی چاہ کرنے لگتے ہیں۔ خیال مختلف سہی، طرز زندگی متضاد سہی لیکن بعض چہرے جو دل کے آئینوں میں پنہاں ہوتے ہیں ان کا عکس اگر کسی چہرے پر نظر آجائے تو ہم پوری طرح قربان ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اور امجد پوری طرح قربان ہونے پر تلا ہوا تھا فرحت، آفتاب، حمیدہ جیسی محبوباؤں کی اس ایک مجموعی شکل پر مر مٹا تھا بس، اسے سلطنت بھا گئی تھی، اس میں زندگی کے کئی رنگ اسے نظر آئے تھے، بہنوں کی سہیلیوں کے نام اب بھول چکا تھا، محلے کی خالاؤں کی لڑکیوں سے سب ناطے رشتے ٹوٹ چکے تھے صرف سلطنت کی "پکی ڈور" سے بندھا قیدی کی طرح گھسٹتا جا رہا تھا۔

ہوا یوں کہ ایک دن اچانک اس کی بہن کی سہیلی اپنے بھائی اور بھابی کو امجد کے گھر لے آئی نئے دلہا دلہن کا امجد کے گھر والوں نے بڑی محبت سے استقبال کیا ہر ایک سے تعارف کرایا گیا، سلطنت پر امجد کی نظر پڑی اور بس! اسے غالب کا شعر یاد آگیا ؎

قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو۔
کاش! کہ تم مرے لئے ہوتے

سلطنت کا میکہ برائے نام تھا ماں باپ کے گذر جانے کے بعد بھائی بھاوج سلطنت کی شادی کر کے مطمئن ہو گئے تھے، امجد کے والدین سلطنت کو بہت چاہتے تھے، سلطنت اکثر آنے جانے لگی جو لوگ محبت کے بھوکے ہوتے ہیں ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا یہ بھوک ہمیشہ باقی رہتی ہے، سلطنت کا شوہر انور اس گھر کو ہی اپنی سسرال سمجھ کر ٹھاٹ سے آتا تو کبھی سلطنت کو چھوڑ جاتا، دن گذرنے لگے امجد، سلطنت کا تو بے تکلف ہو چکا تھا، ایک دن خواب میں دیکھا کہ سلطنت اس کی دلہن بنی ہے، آنکھ کھلتے ہی بھاگا ماں کے پاس، امی! میری شادی سلطنت سے کروا دیں؟! کیا ہے امی! کیوں آنکھیں کرۂ ارض کا زاویہ بنا بیٹھیں، "وہ شادی شدہ ہے" تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ امی! تو کیا ہوا؟ اس کے میاں سے طلاق دلا کر مجھے سلطنت دے دیجئے نا؟ امی نے زوردار طمانچہ امجد کے منہ پر مار دیا، امی کا طمانچہ زیادہ تکلیف دہ نہ تھا جتنا کہ ان کا انکار، اس وقت تو وہ چپ ہو گیا مگر ذہن میں اس نے پروگرام ترتیب دینا شروع کر دیا۔ ہر بار سلطنت کو اپنی باتوں میں الجھائے رکھتا، کبھی خود بھی سلطنت کے گھر چلا جاتا اور یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔

سلطنت ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی اس کا شوہر بینک میں ملازم تھا، امجد بار بار شوہر کی غیر موجودگی میں آتا اور اس کے آنے سے پہلے چلا جاتا، پڑوسیوں نے

سلطنت کے شوہر سے دبے دبے لفظوں میں تشویش کا اظہار کیا، شوہر اچھا یا برا نہیں ہوتا اس کی تقسیم عام ہوتی ہے شکی، حاسد، خود غرض اور عیب تک یہ سب نہ ہو شوہر کا رشتہ مکمل نہیں ہو پاتا۔ انور نے رفتہ رفتہ سلطنت سے اپنے رویہ میں تبدیلیاں شروع کیں اور آخر وہ دن بھی آگیا جب سلطنت کا طلاق ہو گیا، سلطنت پر بدکرداری کا الزام لگا اور وہ مطلقہ کہلائی جانے لگی، امجد باغ باغ ہو گیا، آخر امی سے کہہ ڈالا کہ وہ اب تو سلطنت ہی سے شادی کرے گا امی مطلقہ کو بہو بنانے سے انکار کرنے لگیں تو کہنے لگا، امی آپ اگر راضی نہ ہوئیں تو میں "کورٹ میرج" کرلوں گا، خاندان میں تہلکہ مچ گیا آخر چاہت کی جیت ہوئی سلطنت امجد کی بیوی بن گئی امجد ہر طرح خوش تھا اور سلطنت کے دامن کو سبھی خوشیوں سے بھرتا جا رہا تھا۔

ایک بار یونہی باتوں باتوں میں امجد نے ماضی کا ذکر چھیڑ دیا اور اپنی کی ہوئی سازش پر قہقہے لگانے لگا، سلطنت کو اب ساری بات سمجھ میں آگئی اس نے اسی وقت دل میں عہد کر لیا کہ وہ ضرور انتقام لے گی۔ وہ خود اپنی شناخت بنائے گی، جس طرح اس کے پہلے شوہر انور کے نام سے پہچانی گئی اب دوسرے شوہر امجد کے نام سے نہیں جانی جائے گی یہ مرد کی خوش فہمی ہے جو وہ اپنا نام دے کر سمجھتا ہے کہ بڑی عزت افزائی کر گیا مگر عزت تو اپنے کردار سے ہوتی ہے، وہ زخم بھرا نہیں تھا جب اس کے سابقہ شوہر نے اس پر بدچلنی کا الزام لگایا تھا جس کی وجہ امجد تھا صرف امجد۔

سلطنت نے بڑی مصلحت سے کلب کی خواہش کی امجد اور سلطنت کلب کے ممبر بن گئے اور ممبر بننے کے بعد اپنے حلقے میں کافی مقبول ہو گئے، کلب کے ماحول میں رشتے، ناطے نہیں ہوتے وہاں "ممبر شپ" ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد "فرینڈشپ"

کا ایبل یقینی ہوتا ہے عام طور پر" بیوی دوسرے کی" یا "شوہر دوسری کا" لیبل پر ہوتے ہیں، اور ایسا ہونے لگا تھا شہر کے مشہور افتخار نواب سارے کلب میں شہنشاہ کی حیثیت رکھتے تھے، سلطنت میں کافی دلچسپی لینے لگے، سلطنت کو بس ایک سیڑھی چاہیے تھی سو مل گئی اس کی آواز بڑی دلکش تھی وہ غزلیں بہت ہی پُراثر انداز میں سناتی ایک بار افتخار نواب نے دونوں کو اپنے گھر مدعو کیا وہاں اور بھی مہمان تھے ڈنر کے بعد افتخار نواب نے اعلان کیا کہ اب سلطنت غزل سنائیں گی، محفل جم گئی سلطنت کی آواز نے

"ہمیں یاد ہے وہ سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"
ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

والی مشہور غزل سے سماں باندھ دیا، افتخار نواب بے حد مسرور تھے سلطنت کا شکریہ ادا کیا اور اُسے بہت جلد ٹی وی آرٹسٹ کے روپ میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی سلطنت نے حامی بھر لی، امجد کو سلطنت کی کسی بات پر کبھی اعتراض نہ تھا، افتخار نواب کی عنایت نے سلطنت کو ریڈیو اور ٹی وی کی جان بنا دیا اور کئی محفلیں اس کے نام سے منسوب ہونے لگیں ہر طرف سے سلطنت کی آوازیں آنے لگیں لوگ امجد کو نظر انداز کرنے لگے ویسے یہ قدرتی بات ہے کہ اہمیت شمع کی ہوتی ہے پروانے کی نہیں......

ان حالات سے مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن سلطنت نے امجد سے کہا امجد میں تم سے طلاق لینا چاہتی ہوں، مجھے طلاق دیدو!!!

نئے شہر کی تعمیر کے لئے مضافاتی علاقے میں کہیں دور پہاڑ توڑنے کے لئے بم لگایا جا رہا تھا جس کے دھماکے امجد کے دل اور دماغ میں بھی ہونے لگے، امجد نے پوچھا مگر کیوں؟ آخر کیوں.........؟

سلطنت نے کہا میں اب ایک فنکارہ ہوں" اور تم؟ تم کچھ بھی نہیں ہو میری شناخت ہے تمہاری پہچان کچھ بھی نہیں۔ بس ایسا ہمسفر چاہتی ہوں جس کی شناخت ہو، جس کا کوئی تعارف ہو میں تم سے طلاق لے کر افتخار نواب سے شادی کر رہی ہوں جن کی میں شناخت ہوں اور وہ میری شناخت ہیں۔

امجد نے صحن کی طرف دیکھا جہاں گرد اڑنے لگی تھی" اور ہوا کا چکر چلنے لگا تھا لیکن یہ بادِ خوشگوار کا رقص نہیں تھا یہ قتل ہوتے ہوئے موسم کی تڑپ تھی ....

وہ تڑپ جو بالکل آخری ہوتی ہے ......

چشمِ نم

اماں ــــ اماں ــــ آں ــــ آں ــــ

نوشین کی چیخ سے حویلی کے بام و در تھرا گئے کمروں میں بیٹھی خواتین اور کاموں میں لگی مامائیں بھی دوڑی آئیں بڑے سے دالان میں نوشین ایک نابینا بوڑھی خاتون کی گود میں سر رکھے زاروقطار رو رہی تھی اصغری بیگم بار بار پوچھ رہی تھیں، یہ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ وہ دیکھ نہیں سکتی تھیں ان کی بصارت بیس سال پہلے جا چکی تھی، عزیزہ بیگم حیران، پریشان نوشین کو سمجھا رہی تھیں، وقت نے آگے بڑھ کر تسلی کا دامن نوشین کے سر پہ ڈال دیا، سسکیاں کم ہونے لگیں تو اصغری بیگم کا چہرہ چومتے ہوئے وہ ان کے قدموں میں گر گئی، اماں میں ہوں، تمہاری بیٹی شانو جو میلے میں کھو گئی تھی، ارے میری شانو، شانو چندا ــــ اصغری بیگم کی بصارت سے بیگانہ آنکھوں سے اجالے بہہ نکلے ماں بیٹی گلے لگ کر رونے لگیں، بہت ہی رقت آمیز منظر تھا، وہاں موجود سب کی آنکھیں بھر آئیں تھیں، جدائی کے وقت تو آنکھیں بھر آتی ہی ہیں لیکن برسوں بعد ملن ہو تو آنسو طوفان بن جاتے ہیں۔ حالات کی تیز آندھیوں نے نوشین کو میلے سے اٹھا کر ایک لاولد، نیک ہستی کی گود میں ڈال دیا تھا اس وقت اس کی عمر

سلطنت نے شوہر سے دبے دبے لفظوں میں تشویش کا اظہار کیا شوہر اچھا یا برا نہیں ہوتا اس کی قسم عام ہوتی ہے شکی، حاسد، خود غرض اور جب تک یہ سب نہ ہو شوہر کا رشتہ مکمل نہیں ہو پاتا، انور نے رفتہ رفتہ سلطنت سے اپنے رویہ میں تبدیلیاں شروع کیں اور آخر وہ دن بھی آگیا جب سلطنت کا طلاق ہو گیا، سلطنت پر بدکرداری کا الزام لگا اور وہ مطلقہ کہلائی جانے لگی، امجد باغ باغ ہو گیا، آخر امی سے کہہ ڈالا کہ وہ اب تو سلطنت ہی سے شادی کرے گا امی مطلقہ کو بہو بنانے سے انکار کرنے لگیں تو کہنے لگا، امی آپ اگر راضی نہ ہو سکیں تو میں "کورٹ میرج" کرلوں گا، خاندان میں تہلکہ مچ گیا آخر چاہت کی جیت ہوئی سلطنت امجد کی بیوی بن گئی امجد ہر طرح خوش تھا اور سلطنت کے دامن کو سبھی خوشیوں سے بھرتا جا رہا تھا۔

ایک بار یونہی باتوں باتوں میں امجد نے ماضی کا ذکر چھیڑ دیا اور اپنی کی ہوئی سازش پر قہقہے لگانے لگا، سلطنت کو اب ساری بات سمجھ میں آگئی اس نے اسی وقت دل میں عہد کر لیا کہ وہ ضرور انتقام لے گی۔ وہ خود اپنی شناخت بنائے گی، جس طرح اس کے پہلے شوہر انور کے نام سے پہچانی گئی اب دوسرے شوہر امجد کے نام سے نہیں جانی جائے گی یہ مرد کی خوش فہمی ہے جو وہ اپنا نام دے کر سمجھتا ہے کہ بڑی عزت افزائی کر گیا مگر عزت تو اپنے کردار سے ہوتی ہے، وہ زخم بھرا نہیں تھا جب اس کے ساتھ شوہر نے اس پر بدچلنی کا الزام لگایا تھا جس کی وجہ امجد تھا صرف امجد،

سلطنت نے بڑی مصلحت سے کلب کی خواہش کی امجد اور سلطنت کلب کے ممبر بن گئے اور ممبر بننے کے بعد اپنے حلقے میں کافی مقبول ہو گئے، کلب کے ماحول میں رشتے، ناطے نہیں ہوتے وہاں "ممبر شپ" ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد "فرینڈ شپ"

کا لیبل یقینی ہوتا ہے عام طور پر "بیوی دوسرے کی" یا "شوہر دوسری کا" لیبل پڑھتے ہیں، اور ایسا ہونے لگا تھا شہر کے مشہور افتخار نواب سارے کلب میں شہنشاہ کی حیثیت رکھتے تھے، سلطنت میں کافی دلچسپی لینے لگے، سلطنت کو بس ایک سیڑھی چاہئے تھی سو مل گئی اس کی آواز بڑی دلکش تھی وہ غزلیں بہت ہی پُراثر انداز میں سناتی ایک بار افتخار نواب نے دونوں کو اپنے گھر مدعو کیا وہاں اور بھی مہمان تھے ڈنر کے بعد افتخار نواب نے اعلان کیا کہ اب سلطنت غزل سنائیں گی، محفل جم گئی سلطنت کی آواز نے

"ہمیں یاد ہے وہ سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"
ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

والی مشہور غزل سے سماں باندھ دیا، افتخار نواب بے حد مسرور تھے سلطنت کا شکریہ ادا کیا اور اُسے بہت جلد ٹی وی آرٹسٹ کے روپ میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی سلطنت نے حامی بھر لی، امجد کو سلطنت کی کسی بات پر بھی اعتراض نہ تھا، افتخار نواب کی عنایت نے سلطنت کو ریڈیو اور ٹی وی کی جان بنا دیا اور کئی محفلیں اس کے نام سے منسوب ہونے لگیں ہر طرف سے سلطنت کی آوازیں آنے لگیں لوگ امجد کو نظر انداز کرنے لگے ویسے یہ قدرتی بات ہے کہ اہمیت شمع کی ہوتی ہے پروانے کی نہیں.........

ان حالات سے مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن سلطنت نے امجد سے کہا امجد!

میں تم سے طلاق لینا چاہتی ہوں، مجھے طلاق دیدو!!!

نئے شہر کی تعمیر کے لئے مضافاتی علاقے میں کہیں دور پہاڑ توڑنے کے لئے بم لگایا جارہا تھا جس کے دھماکے امجد کے دل اور دماغ میں بھی ہونے لگے، امجد نے پوچھا مگر کیوں؟ آخر کیوں.........؟

سلطنت نے کہا میں اب ایک فنکارہ ہوں، اور تم؟ تم کچھ بھی نہیں ہو میری شناخت ہے تمہاری پہچان کچھ بھی نہیں، میں ایسا ہمسفر چاہتی ہوں جس کی شناخت ہو، جس کا کوئی تعارف ہو میں تم سے طلاق لے کر افتخار نواب سے شادی کر رہی ہوں جن کی میں شناخت ہوں اور وہ میری شناخت ہیں۔

امجد نے صحن کی طرف دیکھا جہاں گرد اڑنے لگی تھی، اور ہوا کا چکر مچلنے لگا تھا لیکن یہ بادِ خوشگوار کا رقص نہیں تھا یہ قتل ہوتے ہوئے موسم کی تڑپ تھی ....

وہ تڑپ جو بالکل آخری ہوتی ہے ....

چشمِ نم

اماں ــــــ اماں ــــــ آں ـــــ آں ـــــ

نوشین کی تیز چیخ سے حویلی کے بام و در تھرا گئے کمروں میں بیٹھی خواتین اور کاموں میں لگی ماماِئیں سبھی دوڑی آئیں بڑے سے دالان میں نوشین ایک نابینا بوڑھی خاتون کی گود میں سر رکھے زار و قطار رو رہی تھی اصغری بیگم بار بار پوچھ رہی تھیں، یہ کون ہے ؟ یہ کون ہے؟ وہ دیکھ نہیں سکتی تھیں ان کی بصارت بیس سال پہلے جا چکی تھی، عزیزہ بیگم حیران، پریشان نوشین کو سمجھا رہی تھیں، وقت نے آگے بڑھ کر تسلی کا دامن نوشین کے سر پہ ڈال دیا، سسکیاں کم ہونے لگیں، اصغری بیگم کا چہرہ چومتے ہوئے وہ ان کے قدموں میں گر گئی، اماں میں ہوں، تمہاری بیٹی شانو جو میلے میں کھو گئی تھی، ارے میری شانو، شانو چندا ـــــ اصغری بیگم کی بصارت سے بیگانہ آنکھوں سے اجالے بہہ نکلے ماں بیٹی گلے لگ کر رونے لگیں، بہت ہی رقت آمیز منظر تھا، وہاں موجود سبھی کی آنکھیں بھر آئیں تھیں، جدائی کے وقت تو آنکھیں بھر آتی ہی ہیں لیکن برسوں بعد ملن ہو تو آنسو طوفان بن جاتے ہیں۔ حالات کی تیز آندھیوں نے نوشین کو میلے سے اٹھا کر ایک لاولد، نیک ہستی کی گود میں ڈال دیا تھا اس وقت اس کی عمر

چھ سات سال رہی ہو گی وہ بزرگ جن کا نام صابر علی تھا اس بچی کو اللہ کا کرم سمجھ کر اورنگ آباد اپنے ساتھ لے گئے ان کو اولاد کی کمی پوری ہوتی نظر آئی انھوں نے بچی کا نام بدل کر شاہ نور سے نوشین رکھ دیا، پڑھایا لکھایا ان کی بیگم بھی نیک خاتون تھیں انھوں نے ممتا کی تمام شرطیں پوری کیں آخر حیدر آباد کے ایک معزز گھرانے سے آئے ہوئے رشتے کو قبول کرتے ہوئے نوشین کی شادی کر دی۔ نوشین کا سسرال بہت امیر تھا اس گلابی بنگلے کے اطراف سبز جھاڑیاں اور رنگ برنگے پھول، صاحب خانہ کے اعلیٰ ذوق کی دلیل تھے۔ پڑوس میں عزیزہ بیگم کی حویلی تھی جن کی اکلوتی بیٹی رضیہ بیگم نوشین کی سہیلی تھی عزیزہ بیگم گھر داماد کی قائل تھیں انھیں بیٹی کو الگ کرنا بالکل پسند نہ تھا، نوشین اور رضیہ بیگم کی دوستی کی وجہ آنا جانا رہتا تھا اس وقت بھی نوشین حویلی میں آئی تھی لیکن اصغری بیگم کو دیکھ کر بے اختیار ہو گئی جب وہ ماں سے بچھڑی تھی تو ماں کے نقوش ذہن کے کینوس پر اچھی طرح رنگ جما چکے تھے یادداشت میں نوشین نے اپنی ماں کی تصویر سجا رکھی تھی، تقسیم ہند کے وقت جب ہنگامے ہونے لگے تو بیوہ اصغری بیگم، نوشین کو تلاش کر کے تھک گئی تو ان کی بہن نے انھیں بھی پاکستان بلا لیا، اصغری بیگم بیٹی کی جدائی میں آنسو بہاتی رہی کافی عرصہ گزر جانے کے بعد وطن یاد آیا تو حیدر آباد لوٹیں اور اپنی عزیز سہیلی عزیزہ بیگم کے یہاں قیام کیا ــــ

ماں مجھے دیکھو نا، ماں تمہاری شانو کتنی بڑی ہو گئی، کیسا سراپا نکالا ہے، تم نے میری نظر بھی نہیں اتاری ماں، تم اپنی بیٹی کو کھو کر نہ جانے کیسے جیتی رہیں، تمہاری آنکھیں بھی یقیناً میرے ہی غم میں جاتی رہیں ہے نا ماں؟ ہاں، میری بچی، ہاں میری چندا ــــ ماں ممتا کی آنکھوں سے شانو کو دیکھ رہی تھیں، شانوں پر، چہرے پر ماں

کے شفقت بھرے ہاتھ نوشین کو جنت کی سیر کرا رہے تھے رات بھیگی ہوئی تھی اس تنہا مجبور بھکارن کی پلکوں کی طرح جس کا دامنِ طلب خالی رہ جاتا ہے ۔۔۔۔۔ آنسوؤں کا سیلاب کم ہوا تو نوشین نے اپنی کہانی ماں کو سنانے کے بعد کہا، ماں میں تمہاری آنکھوں کو روشنی دوں گی، تم مجھے دیکھنا، کہ تمہاری بیٹی کا رنگ کیسا ہے، قد کیسا ہے، بال کیسے ہیں چہرہ کیسا ہے، چلتی کس طرح ہوں، بولتی ہوئی کیسی لگتی ہوں، ہنستی ہوں تو کیسی لگتی ہوں، ماں کیا تم مجھے نہیں دیکھنا چاہتیں ؟ میری رانی، میں تجھے دیکھنا چاہتی ہوں بڑی تمنا ہے کاش ایسا ہو سکے تو کتنا اچھا ہو ؟ ماں نے حسرت سے کہا، بس تو پھر آپ کل ہی میرے ساتھ چلئے میں شہر کے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی جس نے کئی آنکھوں کو روشنی دی ہے کئی زندگیوں میں چراغ جلائے ہیں ۔۔۔۔۔

اور پھر دوسرے دن نوشین ڈاکٹر رام کے پاس ماں کو لے کر پہنچ گئی، معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے نوشین سے کہا ان کی آنکھوں کی پیوندکاری تو ہو سکتی ہے لیکن ان آنکھوں کی روشنی لوٹنا ممکن نہیں ۔ کیا ؟ نوشین دھک سے رہ گئی ۔ پل بھر میں نوشین نے اپنا فیصلہ ڈاکٹر کو سنا ڈالا، ڈاکٹر صاحب آپ میری آنکھیں میری ماں کو لگا دیجئے نا ! ڈاکٹر صاحب میری ماں مجھے دیکھنا چاہتی ہے وہ ڈاکٹر صاحب سے عاجزی کرنے لگی، ڈاکٹر نے کہا لیکن جب وہ دیکھیں گی کہ تمہاری آنکھیں نہیں ہیں تو ان پہ کیا گذرے گی اور پھر یہ بات انسانیت کے خلاف بھی ہے ۔۔۔۔۔ آپ اخبار میں اشتہار دیں تو شائد کوئی عطیہ دے دے نہیں ڈاکٹر صاحب نہیں میں ماں کی خدمت کرنا چاہتی ہوں میں اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا لوں گی ۔ میں نے اپنی ماں کو دیکھ لیا ہے اب دنیا میں ہے کیا دیکھنے کے لیے ؟ میری ماں مجھے دیکھنے سے محروم کیوں رہے ؟ ڈاکٹر صاحب انکار نہ

کیجیے آخر نوشین نے ڈاکٹر کو منا ہی لیا ـ ـ اصغری بیگم کی آنکھوں کا آپریشن کامیاب رہا بیٹی کھو گئی ماں کے قدموں میں بیٹھی ہوئی نوشین کے چہرے پر دنیا بھر کی بہاریں چھا گئی تھیں

اصغری بیگم نے نوشین کو دیکھتے ہی بلائیں لینا شروع کیں ماں واری جا رہی تھی، بیٹی کا نکھرا، دلکش پیکر، اصغری بیگم نے خواب میں بھی ایسی خوشی کے بارے میں نہ سوچا تھا، اللہ نے آج ان کی آخری خواہش پوری کر دی تھی، بیٹی! یہ چشمہ نکال دے میں تیری آنکھیں چوم لوں برسوں بعد بھی مجھے پہچان لینے والی پیاری آنکھیں ـ ـ ـ ـ ـ نوشین سر جھکائے ماں کا ہاتھ چوم رہی تھی ماں کے ہاتھ پر خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، ارے یہ کیا؟ اصغری بیگم نے پاس کھڑی نرس کو دیکھا یا نرس ڈاکٹر کو بلا لائی، ڈاکٹر نے کہا آپ کی بیٹی نے اپنی آنکھیں آپ کو لگوا دی ہیں تاکہ آپ ان کو دیکھ کر خوش ہو سکیں، ہائے بیٹی یہ تو نے کیا کیا ـ؟ اصغری بیگم رونے لگیں نوشین نے کہا مت رو ماں، مت رو میری آنکھوں سے تم مجھے دیکھ رہی ہو مگر یہ سب بھی تمہارا ہی ہے نا تم نے مجھے پیدا کیا، پالا میرا رواں رواں تمہارا احسان مند ہے تمہاری چیز میں نے تم کو دی ہے تو کیا ہوا؟ تم مجھے دیکھ رہی ہو، پھر روتی کیوں ہو؟ ماں نے کہا میری بچی! آنکھیں تیری ہیں لیکن یہ آنسو تو میرے ہیں نا! یہ منتقل نہیں ہو سکتے نوشین اور بھی رونے لگی نوشین کی آنکھوں کی جگہ بنے ہوئے غاروں میں سے خون ابلنے لگا، نوشین ماں کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی، غم اور خوشی کے اس سنگم کی شدت سے نوشین کی دماغ کی شریانیں پھٹ گئی تھیں!!! ـ ـ

"بھنور"

گھر کے زنانی گیٹ سے بی بی نے باہر قدم رکھا مردانی، ڈرائنگ روم کی طرف جانے کے لئے اور اِدھر سامنے کھڑے ہوئے ماسٹر صاحب نے کیمرہ کا بٹن دبا دیا۔ بی بی دونوں ہاتھوں میں کتابیں تھامے دو بڑی بڑی موٹی چوٹیاں سامنے ڈالے دروازے میں ٹھٹھک گئی، ماسٹر صاحب نے شکریہ کہتے ہوئے سر کے اشارے سے ڈرائنگ روم کی طرف چلنے کو کہا، بی بی آگے بڑھ آئی اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی، مشرقی انداز میں سجایا ہوا دیوان خانہ۔ بہترین فرش اور اعلیٰ قسم کے گاؤ تکیوں سے آراستہ تھا، ماسٹر صاحب نے بی بی کا ہوم ورک چیک ... دیکھی یہ کیا ہے؟ ماسٹر صاحب اور بھی سرخ ہو گئے بی بی نے بھولپن سے اسی صفحہ کو دیکھا جہاں بارش پر لکھے گئے مضمون کے ساتھ ساتھ تتلیاں اور پھول بنے ہوئے تھے اس طرح کے نقش و نگار نہ کرنے کی بارہا ماسٹر صاحب نے تاکید کی تھی مگر بی بی کو نہ جانے لکھتے وقت کیا ہو جاتا کہ وہ غیر ارادی طور پر منظر بنا بیٹھتی کبھی طلوع آفتاب تو کبھی ستاروں کی انجمن کبھی باوقار انداز میں ٹھہرے پہاڑ اور ان کے درمیان گستاخی سے بہتا ہوا، آبشار بہرحال بی بی نے ماسٹر صاحب سے کہا یہ تتلیاں اور پھول بنائے ہیں میں نے بارش پر صرف مضمون لکھ دینے سے کیا ہوتا ہے؟ تتلیاں، پھول بارش کے موسم میں بہت نظر آتے ہیں اس لئے ان کی تصویر بھی میں نے بنا دی......

ماسٹر صاحب جھلّا گئے اور کہا چلو اب تمہاری سزا یہ ہے کہ تم دوبارہ نیا مضمون خوش خط لکھ کر ابھی مجھے دکھاؤ۔ بی بی نے سعادت مند شاگرد کی طرح کاپی

بے لی اپنا قلم وہ اندر ہی بھول گئی تھی ماسٹر صاحب! میں قلم لے آؤں ؟ بی بی نے اجازت چاہی ۔ ماسٹر صاحب نے کہا کوئی ضرورت نہیں یہ لو میرا قلم اس سے لکھو اور اپنا قلم بی بی کے ساتھ میں دے دیا دس سالہ بی بی نے سنہری کیپ والے قلم کو بڑی توجہ سے دیکھا اور ماسٹر صاحب سے پوچھنے لگی کیا یہ قلم سونے کا ہے ؟ ماسٹر صاحب نے کہا ہاں! کیا آپ اس کی مجھے انگوٹھی بنا کر دے سکتے ہیں؟ بی بی نے اقرار کروانا چاہا ماسٹر صاحب نے سوال کر ڈالا کیا تم پہنو گی ؟ بی بی نے کہا ہاں آپ دیں گے تو ضرور پہنوں گی ماسٹر صاحب نے پوچھا اور یہ جو تمہارے ہاتھ میں پہلے ہی انگوٹھی ہے اس کا کیا کرو گی ؟ بی بی نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی کہ یہ میں آپ کو دے دوں گی ماسٹر صاحب نے یقین دلایا کہ وہ اس کو ضرور انگوٹھی پہنائیں گے ۔ بی بی مضمون لکھنے میں منہمک ہوگئی اور ماسٹر صاحب چپ چاپ بیٹھے بی بی کا بغور جائزہ لیتے رہے اتنی بڑی بڑی موٹی موٹی چوٹیاں وہ بھی دو، دو گلابی رنگت، افسانوی چہرہ ماسٹر صاحب تو دل ہی دل میں پہلے ہی فدا تھے اب انگوٹھی کے اصرار نے ان کے کافی ارادوں کو مضبوط بنا دیا ایک اکلوتی بیٹی، مالدار گھرانہ، باعزت خاندان ماسٹر صاحب نے قسم کھالی کہ وہ بی بی کو ضرور اپنا کر رہیں گے ۔ ماسٹر صاحب خود بھی کافی حسین آدمی تھے کالج میں انجنیئرنگ پڑھتے ہوئے ٹیوشن کیا کرتے تھے باپ فوجی تھے انتقال ہوچکا تھا بیوہ ماں کی پرورش اور چھوٹی بہن کی تعلیم ان کے ذمہ تھی ۔ مضمون مکمل کرکے بی بی نے کاپی ماسٹر صاحب کے آگے سرکا دی، ماسٹر صاحب نے مزید ہوم ورک دیا اور جانے لگے ماسٹر صاحب یہ کیا ہے ؟ بی بی نے کیمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا یہ ایک طرح کا پنجرہ ہے جس میں میں نے ایک خوب صورت چڑیا بند کر رکھی ہے ماسٹر صاحب مسکرائے، کچھ عرصہ گذر گیا بی بی سیانی ہوچلی تو

سعید حسن نے بی بی کو پردہ کروا دیا اور تعلیم رکوا دی قدامت پسند گھرانے میں تعلیم کی اہمیت پہلے بہت کم ہوا کرتی تھی ماسٹر صاحب بے چین رہنے لگے ان کی ایک خالہ کو انھوں نے سعید حسن کے یہاں اپنے اور بی بی کے رشتے کی بات کرنے بھیجا خالہ، سعید حسن سے ملیں اور مدعا بیان کیا سعید حسن نے سوچ کر جواب دینے کو کہا۔ انھوں نے قریبی دوستوں سے مشورہ کیا سب نے اس رشتے کو پسند کیا ماسٹر صاحب آخر انجینیر تھے، حسین تھے اخلاق اور قابلیت میں یکتا اعلیٰ خاندان سب ہی کچھ تھا سوائے دولت کے بی بی کی ماں بچپن میں ہی انتقال کر چکی تھیں اس لئے سعید حسن ہی بی بی کی ماں اور باپ دونوں تھے انھوں نے یونہی بیٹی سے پوچھا، تمہارے ماسٹر صاحب تمہیں کیسے لگتے ہیں؟ تیرھویں سال کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی بی بی نے الھڑپن سے جواب دیا۔ ہو تو بالکل بندر جیسے، لال لال، بھٹے جیسے سر کے بال، بی بی ان کی نقل دکھانے لگی سعید حسن نے محسوس کیا کہ بی بی شاید پسند نہیں کرتی اور انھوں نے جواب انکار میں دے دیا۔ ماسٹر صاحب کو اپنی غربت پر بہت غصہ آیا دل ہی دل میں ان کی محبت ان کو راکھ کر گئی وہ ٹوٹ سے گئے اور انھوں نے شہر چھوڑ دیا۔

سعید حسن کی صحت بگڑنے لگی تو انھوں نے ایک معقول رشتہ دیکھ کر بی بی کی شادی کر دی اور خود انتقال کر گئے۔ عرفان، سعید حسن کے دوست کے بیٹے تھے اور ان کی توجہ کا مرکز بھی بی بی ہی تھی وہ کامیاب ہو چکے تھے۔

ایک دن بی بی کسی شادی کی تقریب میں ساس، نندوں کے ساتھ شریک تھی بی بی کی سہیلی غونیہ مل گئی اور بہت گلہ کرنے لگی بی بی! تم نے ماسٹر صاحب کو نہیں دیکھا تم سے شادی نہ ہو سکنے کی وجہ وہ کئی دن تک گھر سے دور جھاڑیوں میں، بیٹھے رہتے ہیں زاں

کا گھر مضافاتی علاقے میں تھا) اور تمہاری شادی کو پندرہ سال ہو گئے مگر انھوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تمہاری ایک تصویر انھوں نے میز پر سجا رکھی ہے۔ تمہارے دونوں ہاتھوں میں کتابیں اور دو چوٹیاں سامنے ہیں وہ اکثر تمہارا ذکر کرتے تھے انھوں نے شہر تمہاری یاد سے بے چین ہو کر چھوڑ دیا..... بی بی حیرت زدہ سی سب سنتی رہی غوثیہ نہ صرف اس کی سہیلی تھی بلکہ وہ بھی ماسٹر صاحب کی شاگرد تھی دو تین سال اور گزر گئے آخر ایک بار پھر کسی جگہ غوثیہ سے ملاقات ہوئی غوثیہ نے ماسٹر صاحب کا حال سنا ڈالا ماں کی حالت نازک ہو گئی تھی شادی کرنی پڑی لڑکی بہت اچھی ہے لیکن ماسٹر صاحب ان سے محبت نہیں کرتے تمہاری تصویر کے بارے میں جب ان کی بیوی نے پوچھا تو انھوں نے کہا آئندہ کبھی نہ پوچھنا یہ تصویر کس کی ہے یہ تصویر میرے مرنے کے بعد ہی یہاں سے ہٹے گی اور آج تک بی بی کی تصویر ان کے بیڈ روم میں لگی ہے۔

بی بی یعنی کہ ناھید اب بھی ماضی کے بارے میں سوچتی ہے تو اسے لگتا ہے اس نے ماسٹر صاحب کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے جب بھی کوئی گھریلو الجھن سے وہ غمزدہ ہوتی ہے تو غوثیہ کی باتیں یاد آتی ہیں۔ " ماسٹر صاحب تمہیں یاد کر کے کئی بار میرے سامنے رویا کرتے تھے کہتے تھے غوثیہ ! کیا تم مجھ سے ایک بار بی بی کو ملا سکتی ہو ؟ ...... اور ناھید اب اپنے ماسٹر صاحب کو یاد کر کے روتی ہے کہ بے شک ان پر بڑا ظلم ہوا کیا جاتا اگر وہ ان سے ایک بار مل ہی لیتی بے چارے اتنے رنجیدہ تو نہ رہتے صاف ان سے کہدیتی کہ.......

یادوں کے بھنور میں آدمی جب غوطے لگانے لگتا ہے تو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خود ڈوبے گا یا ابھر کر ساحل تک پہنچے گا جو ڈوب گیا سو تو ڈوب گیا لیکن جو ساحل تک پہنچ جاتا ہے وہ بھنور کو کبھی بھول نہیں پاتا.........

"سیلابِ آرزو"

ابھی سبز پتوں کے پیلے پڑنے کا موسم نہیں آیا تھا ابھی تو پھولوں کی زردی خوشگوار، رنگین ماحول کو نمایاں کر رہی تھی۔ تیز بارش کے بعد منظر اور بھی نکھر آیا تھا تتلیوں کے جھنڈ بھیگے غنچوں پر رقص کرتے نظر آتے تھے رفتہ رفتہ دن ڈھلنے لگا اور پھر شجرفی شام ہو ہی گئی بارش تھمنے کے بعد شام کے رنگ برسنے لگے تھے "حنا لاج" میں رنگ و نور کا طوفان امڈ آیا تھا آج آسیہ کی مانجھے کی تقریب تھی گھر کی زیبائش میزبانوں اور مہمانوں کے کے لباس بھی زرد اور چمکیلے تھے "حنالاج" کے اندر گویا "سنہری دور" تھا بہت ہی وسیع دالان کے کونے میں میراثن معین بالو اپنی پختہ آواز میں ہارمونیم سنبھالے ہے

راجہ کی آئے گی بارات ......

والا گیت گا رہی تھی پاس ہی اس کی بیٹی بیٹھی طبلے پر "تال اور سُر" جمانے کی مشق کر رہی تھی۔

آسیہ کے چھوٹے بھائی بہن، مہمان بچوں کے ساتھ کبھی اس حویلی

کی منڈیروں پر چڑھ کر کودنے لگتے تو کبھی صحن سے گیلے پاؤں دوڑتے ہوئے دالان میں آجاتے غرض کہ کافی شور تھا۔

میں خاموش ایک کونے میں مہمانوں کی صف میں شامل اپنی سوچ میں گم تھی آسیہ میرا خواب تھی میں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ دل ہی دل میں کر رکھا تھا اظہار اس لئے نہ کر سکی کہ ابھی میرے لڑکے کو روزگار سے لگے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا میں چاہتی تھی کہ راشد کی شادی اطمینان سے کروں کچھ جمع پونجی اس کے پاس جمع ہو جائے تو اچھا ہے مگر سلطانہ بیگم اور ان کے شوہر افضل میاں کو اپنی بیٹی کی شادی اس لئے جلدی کرنی پڑی کہ رشتہ ایک شاہی گھرانے سے آیا تھا اس شاہی گھرانے کے لئے بطور شہزادی آسیہ پسند کی جا چکی تھی۔ ماں باپ ہاں نہ کرتے تو کیا کرتے ہر طرح سے رشتہ بہتر تھا ہر چند کہ آسیہ کا گھرانہ بھی جاگیر دار گھرانہ تھا میرے پاس شادی سے ایک ہفتہ پہلے رقعہ بھیجا گیا میں نے اُسے دیکھا بھی نہیں، دیکھتی بھی کیسے اپنی آرزو کو مٹتا دیکھ کر چپ ہو جانا پڑا میں نے آسیہ کے کیا کیا خواب دیکھ ڈالے تھے اس کو مجسم اپنے گھر میں بہو کے روپ میں دیکھا تھا کبھی وہ کچن میں کام کر رہی ہے۔ کبھی نوکروں کو ہدایت دے رہی ہے کبھی میرے پاس آ بیٹھی ہے میری گود میں سر رکھے لاڈ کر رہی ہے تو کبھی میری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی پاکستانی ڈرامے دیکھ رہی ہے۔

میں قاعدے کے مطابق اصول پسندی سے کام لیتی رہی آسیہ کے

ماں باپ کے سامنے صرف اس لئے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ ابھی اس کا مناسب موقع نہیں آیا تھا مگر اچانک قدرت نے مجھے چونکا دیا میں مجبوری کی شکستہ ناؤمیں وقت کے تیز دھاروں کی زد میں آگئی تھی۔

سلطانہ بیگم نے مجھے آواز دی تو میں خیالوں سے چونک پڑی آسیہ کو پھول پہنانے کی رسم ادا کی جارہی تھی مجھے بھی اس کا منہ میٹھا کرنا تھا۔ پھول پہنانا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بلائیں لینا تھا میں اپنے اندر خود کو ٹوٹتا محسوس کر کے جلدی سے اٹھ گئی بکھرے ہوئے صبر کے موتی سمیٹے اور دامنِ دل کی گرہ میں باندھ لئے میں نے مسکراتے ہوئے رسم ادا کی اس کے بعد کھانا ہوا گانے بجانے کا سلسلہ جاری تھا میں واپس آگئی شادی میں نہ جانے کا فیصلہ میں کر چکی تھی۔

کیسے ممکن تھا کہ جس لڑکی کو میں وداع کر کے اپنے گھر لانا چاہتی تھی اس کو کسی اور گھر کے لئے وداع کر کے خالی ہاتھ گھر لوٹتی۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گئی اچانک دامنِ دل کی گرہ کھل گئی موتی بکھر کر میری آنکھوں سے گرنے لگے میرے شوہر مجھے بڑی محبت سے سمجھانے لگے ان کو میری اس آرزو کی خبر تھی وہ سمجھاتے ہی جارہے تھے کہ جوڑے اللہ بناتا ہے ہو سکتا ہے اس میں کوئی مصلحت ہو، اللہ کی طرف سے جو ہوتا ہے وہی مناسب ہوتا ہے جو بہو نہ بن سکی وہ تمہاری بیٹی کی طرح ہے تمہاری سہیلی کی بیٹی ہے اُسے دعائیں دو، وغیرہ وغیرہ........

سیلاب کے بعد بہت کچھ بہہ جاتا ہے اور کچھ رہ بھی جاتا ہے اور جو رہ جاتا ہے وہ بہر حال بھیگا رہتا ہے آرزو کے اس سیلاب نے غم بہادیا تھا کسک چھوڑ دی تھی میں نے دامنِ دل کو تر بہ تر محسوس کیا اور ضبط کے مضبوط ہاتھوں سے نچوڑ کر وقت کی شاخ پر سوکھنے کے لئے چھوڑ دیا....

قسمت کے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں تو یقیناً آسمان سے ہی جوڑے اتارے جاتے ہوں گے میں آسمان کی طرف بڑی امید سے دیکھتی ہوں میرے بیٹے کے لئے آسمان سے اتری ہوئی نور کی کرن جیسی اوصافِ حمیدہ رکھنے والی لڑکی ہی مجھے مل جائے گی آسیہ جیسی بڑی بڑی آنکھیں اسی کی طرح ستواں ناک بھرے بھرے خوب صورت گلابی ہونٹ، شہابی رنگ، سرو قد دھیمی آواز دھیما لہجہ، سنہرے بال میرے تصور کی ہو بہو تصویر ہو گی میری آرزو کی تکمیل میرے پھیلے ہوئے خاندان کا چراغ .... اور میں اس سیلابِ آرزو میں بہتی رہوں گی ـــــ

"چمپا کلی"

شاعروں کا یہ کہا ہوگا تمہیں یاد بھی ....

بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی

ضیا بھائی فرحین کو دیکھ دیکھ کر گائے جا رہے تھے فرحین منہ بنائے کھڑی تھی اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ضیا بھائی اپنے گھر سے خالہ کے گھر صرف فرحین کو دیکھنے روز آیا کرتے تھے فرحین ان کی منجھلی خالہ کے پڑوس میں رہتی تھی فرحین کی تخلیق کچھ زیادہ ہی توجہ سے ہوئی تھی عام طور پر اس عمر کی لڑکیاں اتنی حسین نہیں ہوتیں مگر یہ تو آٹھ نو سال کی عمر میں پندرہ سولہ برس سے کم نہیں لگتی تھیں جنہیں عمر کا پتہ نہیں ہوتا وہ فرحین کو سولہ برس کا سمجھ کر رشتے کی بات لے کر آجاتیں نتیجہ ناکامی ...... بھلا فرحین کوئی عام لڑکی تو تھی نہیں کہ کوئی بھی مانگ لے تو مل جائے بہت ہی دولت مند با عزت گھرانے کی حسین بیٹی مانگنے والوں کو اپنے اوپر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ ضیا بھائی خود اسمارٹ تو تھے مگر دولت مند نہیں انھیں فرحین کی سوجھی تھی .... منجھلی خالہ او منجھلی خالہ کیا ہے بیٹے؟ خالہ پیار سے بولیں منجھلی خالہ میں اس "چمپا کلی" سے شادی کروں گا۔ ضیا بھائی بے دھڑک بول بیٹھے منجھلی خالہ نے گھبرا کر بھانجے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور

سرگوشی کی چپ رہ بیٹا ! کہیں یوسف صاحب نے سن لیا تو قیامت آجائے گی ۔ مگر کیوں منجھلی خالہ ؟ کیا میں اس کے ساتھ نہیں سجتا ؟ منجھلی خالہ نے بلائیں لیں اور کہا ایسے سجنے سے کیا ہوتا ہے چاند مل تو نہیں جاتا نا ؟ ضیا اکڑ گیے نہیں منجھلی خالہ میں اگر شادی کروں گا تو اس چمپا سے ورنہ عمر بھر کنوارا رہوں گا ۔ فرحین سامنے کھڑی تھی بات اس کے سمجھ میں نہ آسکی ایک بار ..... اُونہہ کہا اور پھر صحن کی طرف دوڑ پڑی جہاں تتلیاں پھولوں کے آس پاس اڑ رہی تھیں فرحین کی ماں شمالی ہند کی رہنے والی تھیں ہمیشہ بیٹی کو گوٹے کنارے والے کپڑے اور زیورات سے آراستہ رکھتیں پاؤں میں پائل پہنا کر بیٹی سے کہتیں کہ اس طرح چلو کہ ایک بھی گھنگرو نہ بجے شریف زادیاں ایسے ہی چلتی ہیں فرحین نے ماں کی سرزنش کے باوجود ابھی تک "چلنا" نہیں سیکھا تھا اُسے صرف بھاگتے رہنے کی عادت تھی چھم چھما چھم.........

کچھ عرصہ گذر گیا ضیا کی بات کہیں چل رہی تھی لیکن ضیا کوئی رشتہ جمنے نہیں دے رہے تھے فرحین نے خوب لمبا قد نکالا تھا جیسے واقعی چمپا کی بیل ہو......... ضیا نے اپنی بہن کے ذریعہ ماں باپ تک اپنی پسند کہلا بھیجی تو رضا صاحب پریشان ہو گئے یوسف صاحب ہیں ان میں بھلا کیا مقابلہ ؟ انھوں نے بیٹے کو سمجھایا مگر ضیا نہیں مانا آخر کسی تیسرے ذریعے سے یوسف صاحب کے یہاں پیغام بھیجا تو بے حد حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ۔ ضیا کی بات دوسری جگہ چل تو رہی تھی مگر صرف رسماً.....

ضیا کو اب گھر جانے تک شام ہونے لگی سارا دن منجھلی خالہ کے گھر

میں دالان کے کونے میں گنگناتے ہوئے پڑے رہنے کی عادت ہوگئی تھی فرحینا بھی زیادہ تر وہیں رہتی منجھلی خالہ کی دونوں بیٹیاں اس کی سہیلیاں تھیں عارفہ اور عاقلہ، ضیا بھائی گاتے رہتے :

"بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی"

فرو۔ میری چمپا ذرا پانی تو پلانا ضیا بھائی خواہ مخواہ فرحین کو تکلیف دیتے فرحین کو اتنا معلوم تھا کہ پانی پلانا ثواب ہے۔ فرحین پانی کا گلاس لے کر ضیا بھائی کو دینے دالان کی سیڑھیاں چڑھنے لگی ضیا بھائی نے مذاق کیا چمپا ..... میری چمپ اکلی ..... اور فرحین نے گلاس پوری طاقت سے زمین پر دے مارا وہ یہ بھول گئی کہ پانی پلانا ثواب ہے اسے چمپا کہنے پر بہت غصہ آیا تھا ...... منجھلی خالہ آواز سن کر دوڑی آئیں فرحین نے انجیر کے جھاڑ کی جھکی ہوئی ڈالی سے دو تین کچے انجیر توڑے اور ایک کے بعد ایک ضیا بھائی کو مارنے لگی ضیا بھائی شیر بن گئے چمپا کہہ کر ایک چھپٹ لگائی اور فرحین کو پکڑنے دوڑے فرحین کسی ہرنی کی طرح چھلانگ لگا کر بچ نکلی مگر اس کا گوٹے والا گلابی ڈوپٹہ ضیا کے ہاتھ آگیا۔ اماں نے بیٹی کو یوں چوکڑیاں بھرتے آتے دیکھا وہ بھی بغیر ڈوپٹے کے تو پریشان ہوگئیں پوچھا تو فرحین بولی کہ ضیا بھائی نے لے لیا۔ اماں کو بہت غصہ آیا اماں نے دو طمانچے فرحین کو دے مارے۔ کئی دن فرحین منجھلی خالہ کے گھر نہیں گئی ضیا بھائی کے گانے کی آواز مگر آتی رہتی ؎

یہ میرا دیوانہ پن ہے یا محبت کا قصور

...... ضیا بھائی کا رشتہ کسی جگہ طے ہو گیا مگر شادی سے ایک ہفتہ پہلے بھی وہ انکار کرتے رہے لیکن جب باپ نے دھمکی دی تو ضیا بھائی کی عمر نے جوش دکھایا منجھلی خالہ کے کمرے میں جا کر بلیڈ سے اپنا گلا کاٹ لیا اتفاق سے اسی لمحہ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں دیکھ لیا کہ بھانجے نے خود کو لہو لہان کر لیا ہے ہائے وائے کرنے لگیں سب لوگ جمع ہوئے دواخانہ لے جایا گیا۔ جس وقت انھیں دواخانہ لے جایا جا رہا تھا وہ مسکرا رہے تھے اور عادتاً گنگنا بھی رہے تھے کیوں کہ پڑوسن کا ہنگامہ سن کر فرحین بھی دوڑی آئی تھی ضیا بھائی گا رہے تھے ؎

ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے
دل میں چھپا کے پیار کا طوفان لے چلے

اور اسی دم وہ بے ہوش ہو گئے دواخانہ میں کافی علاج ہوا شکر خدا کا یہ ہوا کہ شہ رگ بچ گئی تھی...... ضیا بھائی کے ماں باپ نے خالاؤں نے محبت کا واسطہ دیا قسمیں دیں یہاں تک کہ ماں نے اپنے آپ کو ختم کر لینے کی دھمکی دی کہ فرحین کا خیال چھوڑ دیں جس سے رشتے طے کیا ہے وہ بھی خوب صورت ہے ضیا بھائی ماں سے لپٹ کر خوب روئے اس ننھے بچے کی طرح جو ماں سے چاند مانگتا ہے مگر ماں چاند نہیں دے سکتی کسی طرح وہ راضی ہوئے لیکن ایک شرط رکھی کہ شادی کے دن برات منجھلی خالہ کے گھر کے سامنے کچھ دیر رکے گی اور ضرور رکے گی دولہا میاں سفید گھوڑے پر بینڈ باجے کے ساتھ فرحین کے ڈوپٹہ کا

شملہ باندھے منجھلی خالہ کے گھر کے سامنے رُکے اُوپر بہت دیر تک دیکھتے رہے جہاں سب لڑکیوں کے ساتھ فرمین بھی کھڑی ضیا بھائی کو خوشی سے دیکھ رہی تھی اور سہیلیوں سے کہہ رہی تھی ضیاؔ بھائی نے میرے ڈوپٹہ کا شملہ باندھا ہے دیکھو تو کتنا اچھا لگ رہا ہے سر میں لگی ہوئی چمپا کی کلیوں کا گجرا فرمین نے نکال کر دولہا میاں کی طرف اچھال دیا ضیا بھائی نے فوراً گجرا تھام لیا اور اپنے شملے میں سجا کر سلام کرتے ہوئے مسکرا دیئے اور بارات وقت کی طرح آگے بڑھ گئی ــــــ۔۔۔۔۔

"گُڑیا"

امّاں! مجھے یہ ناچنے والی گڑیا چاہیے، کونے میں کھڑی ہوئی راجستھانی گڑیا ایک دوکان میں کمر اور گردن مٹکا مٹکا کر بٹّو کو للچانے لگی۔ یہ مٹی کی ہے بیٹی، ٹوٹ جائے گی ماں نے سمجھایا نہیں، اماں مجھے یہی ہونا ہے ۔۔۔۔ ننھی بٹّو بضد ہو گئی۔ وہ دیکھو، روشنیاں بجھائی جا رہی ہیں نمائش بند ہونے کا وقت ہے، پھر کبھی لے لیں گے، ماں نے بٹّو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا، اور دوسری طرف مالن بی نے سہارا دیتے ہوئے بٹّو کو زبردستی کھینچا، بٹّو رو رہی تھی، روتی ہی جا رہی تھی، پاؤں روکے "اڑیل ٹٹّو" کی طرح قدم قدم پر رک رہی تھی، کسی طرح یہ لوگ گھر پہنچے، بٹّو اب زور زور سے رونے لگی تھی ماں نے بہت سمجھایا، لیکن ننھی بٹّو ہر پیشکش کو ٹھکراتی گئی وہی ایک رٹ کہ ناچنے والی گڑیا چاہیے ۔۔۔۔۔ آخر ماں کو تدبیر سوجھی، کہا، بیٹی! میں نے تجھے بتایا نہیں ویسی بالکل ویسی ہی بہت بڑی گڑیا میں نے تو پہلے ہی لے کر رکھی تھی، وہ سو رہی ہے میں اسے جگا دیتی ہوں وہ پھر ناچنے لگے گی یہ کہہ کر ماں نے مالن بی سے بٹّو کو سنبھالنے کے لئے کہا اور خود کمرے میں چلی گئیں، کچھ دیر بعد انھوں نے سسکتی بنو سے کہا، آنا، بیٹی!

گڑیا ناچ رہی ہے لیکن اسے چھونا نہیں یہ ٹوٹ جائے گی ۔۔۔۔۔ ماں نے کمرے کے بیچ میں بڑا سا چراغ روشن کر دیا تھا بٹو مالن بی کے آگے کمرے میں بڑے شوق سے داخل ہوئی ایک کونے میں راجستھانی لباس پہنے قد آدم گڑیا گردن مٹکاتے ہوئے مسکرا رہی تھی، بٹو کی خوشی کی انتہا نہ تھی، تالی بجا بجا کر گانے لگی ـــ

جھوم جھوم کے ناچو آج،

گاؤ خوشی کے گیت ۔۔۔۔ ہو ہو ۔۔۔

گڑیا ناچ رہی تھی بٹو سے رہا نہ گیا وہ اسے چھونا چاہتی تھی مالن بی نے کہا کہ ہاتھ نہیں لگانا ورنہ ٹوٹ جائے گی، بٹو نے بڑی مشکل سے بات مانی پھر کمرے کے وسط میں چراغ کو اٹھا لائی اور گڑیا کے بالکل قریب رکھ دیا، گڑیا کی آنکھوں میں زندگی ہی زندگی تھی چھوٹی سی ہیرے کی نتھ جگمگا رہی تھی چراغ کی تیز روشنی میں گڑیا مٹی کی نہیں "کندن" کی لگ رہی تھی بنانے والے نے گڑیا کو بڑی فرصت سے بنایا تھا، بٹو خوشی میں خود بھی گا گا کر ناچنے لگی ۔۔۔۔ گاؤ خوشی کے گیت ۔۔۔۔۔ ایک بڑا سا چکر لیتے ہوئے بٹو چراغ پر گر پڑی، گڑیا بٹو کے کپڑوں میں لگی آگ بجھانے کے لئے جھکی، سر پہ پڑی چنری ڈھلک آئی، چنری گھاگرا جلنے لگے بٹو کے کپڑوں کی آگ بجھا کر گڑیا خود جلنے لگی، بوڑھی مالن بی رات کے اندھیرے میں سیڑھیاں اتر کر پانی کی بالٹی اٹھا کر نہیں لا سکتی تھی چیختی رہ گئی، بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ ۔۔۔۔۔

صبح دالان میں تخت پر گڑیا سفید چادر اوڑھے سو رہی تھی، بٹو رات میں اماں کو ڈھونڈتی ہوئی کسی طرح سو گئی تھی اب ضد کرنے لگی تو مالن بی نے کانپتے ہاتھوں سے سفید چادر سرکا کر ماں کا چہرہ بٹو کے سامنے کر دیا ۔۔۔۔۔ گڑیا ٹوٹ چکی تھی،

...... ضیا بھائی کا رشتہ کسی جگہ طے ہو گیا مگر شادی سے ایک ہفتہ پہلے بھی وہ انکار کرتے رہے لیکن جب باپ نے دھمکی دی تو ضیا بھائی کی عمر نے جوش دکھایا منجھلی خالہ کے کمرے میں جاکر بلیڈ سے اپنا گلا کاٹ لیا اتفاق سے اسی لمحہ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں دیکھ لیا کہ بھانجے نے خود کو لہو لہان کر لیا ہے ہائے وائے کرنے لگیں سب لوگ جمع ہوئے دواخانہ لے جایا گیا۔ جس وقت انھیں دواخانہ لے جایا جا رہا تھا وہ مسکرا رہے تھے اور عادتاً گنگنا بھی رہے تھے کیوں کہ پڑوسن کا ہنگامہ سن کر فرحین بھی دوڑی آئی تھی ضیا بھائی گا رہے تھے سے

ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے

دل میں چھپا کے پیار کا طوفان لے چلے

اور اسی دم وہ بے ہوش ہو گئے دواخانہ میں کافی علاج ہوا شکر خدا کا یہ ہوا کہ شہ رگ بچ گئی تھی...... ضیا بھائی کے ماں باپ نے خالاؤں نے محبت کا واسطہ دیا قسمیں دیں یہاں تک کہ ماں نے اپنے آپ کو ختم کر لینے کی دھمکی دی کہ فرحین کا خیال چھوڑ دیں جس سے رشتے طے کیا ہے وہ بھی خوب صورت ہے ضیا بھائی ماں سے لپٹ کر خوب روئے اس ننھے بچے کی طرح جو ماں سے چاند مانگتا ہے مگر ماں چاند نہیں دے سکتی کسی طرح وہ راضی ہوئے لیکن ایک شرط رکھی کہ شادی کے دن برات منجھلی خالہ کے گھر کے سامنے کچھ دیر رُکے گی اور ضرور رکے گی دولہا میاں سفید گھوڑے پر بینڈ باجے کے ساتھ فرحین کے ڈوپٹہ کا

شملہ باندھے منجھلی خالہ کے گھر کے سامنے رُکے اُوپر بہت دیر تک دیکھتے
رہے جہاں سب لڑکیوں کے ساتھ فرمین بھی کھڑی ضیا بھائی کو خوشی
سے دیکھ رہی تھی اور سہیلیوں سے کہہ رہی تھی ضیاَ بھائی نے میرے ڈوپٹہ کا شملہ
باندھا ہے دیکھو تو کتنا اچھا لگ رہا ہے سر میں لگی ہوئی چمپا کی کلیوں
کا گجرا فرمین نے نکال کر دولہا میاں کی طرف اچھال دیا ضیا بھائی نے فوراً
گجرا تھام لیا اور اپنے شملے میں سجا کر سلام کرتے ہوئے مسکرا دیئے اور
بارات وقت کی طرح آگے بڑھ گئی ـــــ۔۔۔۔

سرگوشی کی چپ رہ بیٹا! کہیں یوسف صاحب نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔ مگر کیوں منجھلی خالہ؟ کیا میں اس کے ساتھ نہیں سجتا؟ منجھلی خالہ نے بلائیں لیں اور کہا ایسجنے سے کیا ہوتا ہے چاند مل تو نہیں جاتا نا؟ ضیا اکڑ گئے نہیں منجھلی خالہ میں اگر شادی کروں گا تو اس چمپا سے ورنہ عمر بھر کنوارا رہوں گا، فرحین سامنے کھڑی تھی بات اس کے سمجھ میں نہ آسکی ایک بار...... اونہہ کہا اور پھر صحن کی طرف دوڑ پڑی جہاں تتلیاں پھولوں کے آس پاس اڑ رہی تھیں فرحین کی ماں شمالی ہند کی رہنے والی تھیں ہمیشہ بیٹی کو گوٹے کنارے والے کپڑے اور زیورات سے آراستہ رکھتیں پاؤں میں پائل پہنا کر بیٹی سے کہتیں کہ اس طرح چلو کہ ایک بھی گھنگرو نہ بجے شریف زادیاں ایسے ہی چلتی ہیں فرحین نے ماں کی سرزنش کے باوجود ابھی تک "چلنا" نہیں سیکھا تھا اُسے صرف بھاگتے رہنے کی عادت تھی چھم چھما چھم.........

کچھ عرصہ گذر گیا ضیا کی بات کہیں چل رہی تھی لیکن ضیا کوئی رشتہ جمنے نہیں دے رہے تھے فرحین نے خوب لمبا قد نکالا تھا جیسے واقعی چمپا کی بیل ہو........ ضیا نے اپنی بہن کے ذریعہ ماں باپ تک اپنی پسند کہلا بھیجی تو رضا صاحب پریشان ہو گئے یوسف صاحب ہیں ان میں بھلا کیا مقابلہ ہے انھوں نے بیٹے کو سمجھایا مگر ضیا نہیں مانا آخر کسی تیسرے ذریعہ سے یوسف صاحب کے یہاں پیغام بھیجا تو بے حد حقارت سے ٹھکرا دیا گیا۔ ضیا کی بات دوسری جگہ چل تو رہی تھی مگر صرف رسماً..... ضیا کو اب گھر جلنے تک شام ہونے لگی سارا دن منجھلی خالہ کے گھر

میں دالان کے کونے میں گنگناتے ہوئے پڑے رہنے کی عادت ہوگئی تھی فرحین بھی زیادہ تر وہیں رہتی منجھلی خالہ کی دونوں بیٹیاں اس کی سہیلیاں تھیں عارفہ اور عاقلہ، ضیا بھائی گاتے رہتے :

"بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی"

فرو۔ میری چمپا ذرا پانی تو پلانا ضیا بھائی خواہ مخواہ فرحین کو تکلیف دیتے فرحین کو اتنا معلوم تھا کہ پانی پلانا ثواب ہے۔ فرحین پانی کا گلاس لے کر ضیا بھائی کو دینے دالان کی سیڑھیاں چڑھنے لگی ضیا بھائی نے مذاق کیا چمپا ..... میری چمپا کلی ..... اور فرحین نے گلاس پوری طاقت سے زمین پر دے مارا وہ یہ بھول گئی کہ پانی پلانا ثواب ہے اسے چمپا کہنے پر بہت غصہ آیا تھا ...... منجھلی خالہ آواز سن کر دوڑی آئیں فرحین نے انجیر کے جھاڑ کی جھکی ہوئی ڈالی سے دو تین کچے انجیر توڑے اور ایک کے بعد ایک ضیا بھائی کو مارنے لگی ضیا بھائی شیر بن گئے چمپا کہہ کر ایک جھپٹ لگائی اور فرحین کو پکڑنے دوڑے فرحین کسی ہرنی کی طرح چھلانگ لگا کر بچ نکلی مگر اس کا گوٹے والا گلابی ڈوپٹہ ضیا کے ہاتھ آگیا۔ اماں نے بیٹی کو یوں چوکڑیاں بھرتے آتے دیکھا وہ بھی بغیر ڈوپٹے کے تو پریشان ہوگئیں پوچھا تو فرحین بولی کہ ضیا بھائی نے لے لیا۔ اماں کو بہت غصہ آیا اماں نے دو طمانچے فرحین کو دے مارے۔ کئی دن فرحین منجھلی خالہ کے گھر نہیں گئی ضیا بھائی کے گانے کی آواز مگر آتی رہتی ہے

یہ میرا دیوانہ پن ہے یا محبت کا قصور

...... ضیا بھائی کا رشتہ کسی جگہ طے ہو گیا مگر شادی سے ایک ہفتہ پہلے بھی وہ انکار کرتے رہے لیکن جب باپ نے دھمکی دی تو ضیا بھائی کی عمر نے جوش دکھایا منجھلی خالہ کے کمرے میں جا کر بلیڈ سے اپنا گلا کاٹ لیا اتفاق سے اسی لمحہ خالہ کمرے میں داخل ہوئیں دیکھ لیا کہ بھانجے نے خود کو لہو لہان کر لیا ہے ہائے وائے کرنے لگیں سب لوگ جمع ہوئے دواخانہ لے جایا گیا۔ جس وقت انھیں دواخانہ لے جایا جا رہا تھا وہ مسکرا رہے تھے اور عادتاً گنگنا بھی رہے تھے کیوں کہ پڑوسن کا ہنگامہ سن کر فرحین بھی دوڑی آئی تھی ضیا بھائی گا رہے تھے ؎

ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے

دل میں چھپا کے پیار کا طوفان لے چلے

اور اسی دم وہ بے ہوش ہو گئے دواخانہ میں کافی علاج ہوا شکر خدا کا یہ ہوا کہ شہ رگ بچ گئی تھی...... ضیا بھائی کے ماں باپ نے خالاؤں نے محبت کا واسطہ دیا قسمیں دیں یہاں تک کہ ماں نے اپنے آپ کو ختم کر لینے کی دھمکی دی کہ فرحین کا خیال چھوڑ دیں جس سے رشتے طے کیا ہے وہ بھی خوب صورت ہے ضیا بھائی ماں سے لپٹ کر خوب روئے اس ننھے بچے کی طرح جو ماں سے چاند مانگتا ہے مگر ماں چاند نہیں دے سکتی کسی طرح وہ راضی ہوئے لیکن ایک شرط رکھی کہ شادی کے دن برات منجھلی خالہ کے گھر کے سامنے کچھ دیر رُکے گی اور ضرور رکے گی دولہا میاں سفید گھوڑے پر بینڈ باجے کے ساتھ فرحین کے دوپٹہ کا

شملہ باندھے منجھلی خالہ کے گھر کے سامنے رُکے اُوپر بہت دیر تک دیکھتے رہے جہاں سب لڑکیوں کے ساتھ فرمین بھی کھڑی ضیا بھائی کو خوشی سے دیکھ رہی تھی اور سہیلیوں سے کہہ رہی تھی ضیاَ بھائی نے میرے ڈوپٹہ کا شملہ باندھا ہے دیکھو تو کتنا اچھا لگ رہا ہے سر میں لگی ہوئی چمپا کی کلیوں کا گجرا فرمین نے نکال کر دولہا میاں کی طرف اچھال دیا ضیا بھائی نے فوراً گجرا تھام لیا اور اپنے شملے میں سجا کر سلام کرتے ہوئے مسکرا دیئے اور بارات وقت کی طرح آگے بڑھ گئی ــــــــ

-۲-

"گُڑیا"

امّاں ! مجھے یہ ناچنے والی گڑیا چاہیے، کونے میں کھڑی ہوئی راجستھانی گڑیا ایک دوکان میں کمر اور گردن مٹکا مٹکا کر ٹبّو کو للچانے لگی۔ "یہ مٹی کی ہے بیٹی، ٹوٹ جائے گی" ماں نے سمجھایا "نہیں، اماں مجھے یہی ہونا ہے ۔ ۔ ۔ ۔" ننھی ٹبّو بضد ہوگئی۔ "وہ دیکھو، روشنیاں بجھائی جا رہی ہیں، نمائش بند ہونے کا وقت ہے، پھر کبھی لے لیں گے،" ماں نے ٹبّو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا، اور دوسری طرف مالن بی نے سہارا دیتے ہوئے ٹبّو کو زبردستی کھینچا، ٹبّو رو رہی تھی، روتی ہی جا رہی تھی، پاؤں روکے "اڑیل ٹٹو" کی طرح قدم قدم پہ رک رہی تھی، کسی طرح یہ لوگ گھر پہنچے، ٹبّو اب زور زور سے رونے لگی تھی ماں نے بہت سمجھایا، لیکن ننھی ٹبّو ہر پیشکش کو ٹھکراتی گئی وہی ایک رٹ کہ ناچنے والی گڑیا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر ماں کو تدبیر سوجھی، کہا، "بیٹی! میں نے تجھے بتایا نہیں ویسی بالکل ویسی ہی بہت بڑی گڑیا میں نے تو پہلے ہی لے کر رکھی تھی، وہ سو رہی ہے میں اسے جگا دیتی ہوں وہ پھر ناچنے لگے گی" یہ کہہ کر ماں نے مالن بی سے ٹبّو کو سنبھالنے کے لئے کہا اور خود کمرے میں چلی گئیں، کچھ دیر بعد انھوں نے سسکتی ٹبّو سے کہا، "آنا، بیٹی!

گڑیا ناچ رہی ہے لیکن اسے چھونا نہیں یہ ٹوٹ جائے گی ۔۔۔۔۔ ماں نے کمرے کے بیچ میں بڑا سا چراغ روشن کر دیا تھا بٹو مالن بی کے آگے کمرے میں بڑے شوق سے داخل ہوئی ایک کونے میں راجستھانی لباس پہنے قدِ آدم گڑیا گردن مٹکاتے ہوئے مسکرا رہی تھی، بٹو کی خوشی کی انتہا نہ تھی، تالی بجا بجا کر گانے لگی ۔

جھوم جھوم کے ناچو آج،
گاؤ خوشی کے گیت ۔۔۔۔۔ ہو ہو ۔۔۔

گڑیا ناچ رہی تھی بٹو سے رہا نہ گیا وہ اسے چھونا چاہتی تھی مالن بی نے کہا کہ ہاتھ نہیں لگانا ورنہ ٹوٹ جائے گی، بٹو نے بڑی مشکل سے بات مانی پھر کمرے کے وسط میں چراغ کو اٹھا لائی اور گڑیا کے بالکل قریب رکھ دیا، گڑیا کی آنکھوں میں زندگی ہی زندگی تھی چھوٹی سی ہیرے کی نتھ جگمگا رہی تھی چراغ کی تیز روشنی میں گڑیا مٹی کی تھی "کندن" کی لگ رہی تھی بنانے والے نے گڑیا کو بڑی فرصت سے بنایا تھا، بٹو خوشی میں خود بھی گا گا کر ناچنے لگی ۔۔۔۔ گاؤ خوشی کے گیت ۔۔۔۔۔ ایک بڑا سا چکر لیتے ہوئے بٹو چراغ پہ گر پڑی، گڑیا بٹو کے کپڑوں میں لگی آگ بجھانے کے لئے جھکی، سر پہ پڑی چنری ڈھلک آئی، چنری کھا گرا جلنے لگے بٹو کے کپڑوں کی آگ بجھا کر گڑیا خود جلنے لگی، بوڑھی مالن بی رات کے اندھیرے میں سیڑھیاں اتر کر پانی کی بالٹی اٹھا کر نہیں لا سکتی تھی چیختی رہ گئی" بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ ۔۔۔۔۔

صبح دالان میں تخت پر گڑیا سفید چادر اوڑھے سو رہی تھی" بٹو رات بھر ماں کو ڈھونڈتی ہوئی کسی طرح سو گئی تھی اب ضد کرنے لگی تو مالن بی نے کانپتے ہاتھوں سے سفید چادر سرکا کر ماں کا چہرہ بٹو کے سامنے کر دیا ۔۔۔۔۔ گڑیا ٹوٹ چکی تھی،

مٹی کی تھی نا؟ اس لئے! ---------

برسوں بعد بٹو کے ہاتھ میں سوئی اس قدر زور سے چبھی کہ آہ نکل گئی، اس کی ماں نے گڑیا بن کر اس کی ضد پوری کر دی تھی، آج بٹو اپنی بیٹی کی گڑیا کے کپڑے سیتے ہوئے ماضی کی بھول بھلیاں میں کھو گئی تھی، عورت ماں بن کر بہت سی قربانیاں دیتی ہے لیکن بٹو کی اماں نے گڑیا بن کر بیٹی کی خواہش پر جان نثار کر دی تھی۔ ممی! ممی تم رو رہی ہو؟ چار سال کی فرحانہ نے بٹو کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، تو بٹو بول پڑی، ہاں بیٹی تمہاری گڑیا کے کپڑے سی رہی تھی ذرا سی سوئی چبھ گئی تو آنسو نکل آئے۔ فرحانہ نے کہا میری ممی کو خون نکلا، آنسو نکلے، مجھے یہ گڑیا نہیں چاہیئے، نہیں چاہیئے اور ننھی فرحانہ نے گڑیا اٹھا کر پھینک دی---------!

"نقشِ سنگ"

ہرے لبادے، اور موٹے منکوں کی مالاؤں سے سجے ہوئے فقیر نے یا اللہ، یا رسول اللہ کی زوردار آواز نکالتے ہوئے پھاٹک کے سامنے "دف" پر زوردار ہاتھ مارنے شروع کئے "دف" کے ساتھ لگی ہوئی پتلی سی آہنی ٹیکیاں بھی گھنگرو کی طرح جھنجھنا اٹھیں اور فقیر اپنے شعائے انداز میں نغمہ سرا ہو گیا ۔

سکھی ری اوڑھ لے تو فاطمہ کی اوڑھنی ....

فاطمہ کی اوڑھنی ....

فاطمہ جو پھاٹک کے اندر کھیل رہی تھی رک گئی اور اپنا رنگین ڈوپٹہ کمر سے کس کر باندھ لیا، اماں نے فقیر کو پھاٹک کھلوا کر آنگن میں چبوترے پر بٹھایا اور سر ڈوپٹے سے ڈھک لیا اور بڑے انہماک سے فقیر کے منہ سے نکلے ہوئے نعتیہ کلام کو سننے میں لگ گئیں اماں بڑی مذہبی تھیں اور فقیروں کو کبھی خالی ہاتھ جانے بھی نہ دیتی تھیں۔ فقیر بھی تان سین کا کوئی رشتہ دار ہی لگ رہا تھا دف تیزی سے بجنے لگا تھاپ کے ساتھ جھنجھناہٹ اور اس کی آواز،

سونے پر سہاگہ نعتیہ کلام، اماں بڑی عقیدت سے بیٹھی سن رہی تھیں اور عقیدت سے آنسو بھی بہا رہی تھیں فاطمہ نے بار بار اپنی اوڑھنی کی طرف دیکھنے والے فقیر کو اپنا دشمن سمجھا اور جب اماں کو روتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ اب یہ فقیر اس کی اوڑھنی ضرور لے گا فاطمہ چلانے لگی، رونے لگی ماں کے گلے لگ کے روتی جا رہی تھی اماں میں نہیں دوں گی، اپنی اوڑھنی ہرگز نہیں دوں گی اماں ..... اپنے رنگ برنگے ڈوپٹے کو اس نے اور بھی کس لیا خوب رو رہی تھی اِدھر فقیر کی ایک ہی رٹ ...... فاطمہ کی اوڑھنی .... باہر سے عمران صاحب آئے تو نقشہ ہی اور نظر آیا بیٹی رو رو کر لال، گلابی ہوگئی تھی بیگم آنسو بہا رہی تھیں فقیر گا بھی رہا تھا بجا بھی رہا تھا۔ عمران صاحب نے شیروانی کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور فقیر کو رخصت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تھما دئے فقیر نے آنے والی سات پشتوں تک کو دعائیں دے ڈالیں عمران صاحب بیٹی کو لے کر دالان پر بیٹھ گئے اور بیٹی سے رونے کی وجہ پوچھی تو چھ، سات سال کی فاطمہ نے پھر سے منہ بنایا اور روتے روتے کہا ابّا وہ فقیر میری اوڑھنی، اوڑھنا چاہتا تھا اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔ معصوم فاطمہ بولتے بولتے چپ ہوگئی ابا نے بیگم سے پوچھا آپ کیوں رو رہی تھیں؟ بیگم نے کہا " بی بی فاطمہ کی اوڑھنی نصیب والوں کو ملتی ہے میں بھی اسی آرزو میں رو رہی تھی " عمران صاحب نے ہنستے ہوئے بیٹی کی کمر سے اوڑھنی نکال کر بیگم کو اوڑھاتے ہوئے کہا لو..... فاطمہ کی اوڑھنی.......

فاطمہ کی شرارتوں سے گھر آباد تھا بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا سوچتی

کہ کہیں بھی جا کر چھپ جاتی ایسی جگہ چھپ جاتی کہ سارا گھر پریشان ہو جاتا مہمان خانے میں ایک بار جا گھسی جہاں بہت سارے بستر رکھے تھے اور ایک گدے میں لپٹ کر چھپ گئی صبح کی اولین ساعتوں سے دوپہر ہو گئی لیکن فاطمہ نہیں ملی اندر، باہر تلاش کے بعد پولیس کو اطلاع کر دی گئی پولیس پہلے گھر میں گھس آئی ہر جگہ تلاش کر کے پولیس والے باہر چلے گئے تو آہستہ سے فاطمہ باہر نکل کر دالان میں آئی تو دیکھا اماں کے منہ پر "خانم" پانی کی چھینٹیں مار رہی تھیں اماں بے ہوش پڑی تھیں اور میری بچی، میری بچی کی رٹ لگائے ہوئے تھیں فاطمہ پڑوسن کے پیچھے سے چلائی اماں........ اماں........ اماں نے آنکھیں کھول دیں بیٹی کو سینے سے لگا کر منہ چومتی رہی کہاں تھی میری بچی؟ ہائے تجھے کون اٹھا لے گیا تھا؟ خبر باہر جا چکی تھی عمران زندگی میں پہلی بار حواس باختہ نظر آئے شیروانی کے کچھ بٹن کھلے ہوئے، آستین چڑھی ہوئی ننگے پاؤں...... فاطمہ! میری بیٹی، الحمد اللہ یا اللہ تیرا شکر ہے اور بس پولیس سے کیس خارج ہو گیا۔ منتیں پوری کی گئیں، نذر و نیاز و صدقات کا بھی سلسلہ اک مدت تک چلتا رہا۔

فاطمہ اپنی ایک سہیلی عطیہ کے ساتھ پھاٹک کے سامنے کھیل رہی تھی کہیں سے سیکل پر ایک لڑکا آیا اس نے دونوں کو دیکھا اور پھر فاطمہ کے قریب آ کر اُسو نے گڑ کی مٹھائی دی اور کہا کہ کھاؤ! فاطمہ نے کھائی لڑکا مسکراتا ہوا چلا گیا گڑ کا مزا فاطمہ کے لئے نیا تھا گھر میں گئی اماں کو منہ کھول کر دکھلاتے ہوئے کہا اماں میرے لئے ملیدے کے بجائے ایسی مٹھائی چاہئے! اماں نے

حیرت سے پوچھا یہ کہاں سے آئی ؟ فاطمہ نے کہا میرا ایک دوست ہاتھ سے کھلا کر گیا ہے اماں حیران ہوگئیں کیسا تھا وہ ؟ فاطمہ بولی بس ایک لڑکا تھا جو ابّا کی طرح شیروانی پہنے تھا اماں نے ایک زوردار طمانچہ بیٹی کے منہ پر لگا دیا فاطمہ تڑپ گئی اماں نے کلّی کروائی کم بخت ! غیر لوگوں کے ہاتھ سے کوئی منہ میٹھا کرواتا ہے؟ اور تاکید کی کہ کبھی ایسا نہ ہو' اور پھاٹک پر تالہ لگا دیا گیا' فاطمہ اداس بیٹھی تھی کل اس وقت وہ لڑکا مٹھائی کھلا کر گیا تھا اسی نے دور سے سیکل پر اسی لڑکے کو آتے دیکھا فاطمہ نے چھت کی منڈیر پر سے اُسے پکارا "میٹھائی والے .... لڑکا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا فاطمہ نے پھر کہا اِدھر' اُدھر لڑکے نے اوپر دیکھا اور کہا میں تمہارے لیے مٹھائی لایا ہوں آکے لے لو' فاطمہ بولی کیسے آؤں ؟ پھاٹک پر تالہ لگا ہے ؟ تو کیا ہوا ؟ تم دیوار پر سے کود کر آجاؤ میں پکڑ لوں گا لڑکا بولا۔ فاطمہ واقعی چھت کی منڈیر پر اوندھی لیٹ گئی پھر اس نے ہاتھوں سے منڈیر پکڑ کر پاؤں نیچے لٹکا دئے لڑکا بولا بس ! اب ہاتھ چھوڑ کر نیچے کود جاؤ ڈرو نہیں میں تھام لوں گا اور فاطمہ نے ہاتھ چھوڑ دیئے لڑکے کا اندازہ غلط نکلا فاطمہ ذرا فاصلہ پر سر پالی میں گر پڑی پاؤں میں موچ آگئی رونے لگی تو لڑکے نے منہ میں مٹھائی رکھتے ہوئے کہا ہمت تمہیں کچھ نہیں ہوا اور اسے اٹھا کر کھڑا کیا مگر فاطمہ ٹھیک طرح کھڑی نہیں ہو پارہی تھی لڑکے نے اُسے پھاٹک کے بازو چبوترے پر بیٹھا دیا اور بھی کچھ مٹھائی فاطمہ کے ہاتھ میں دے دی اور کہا' مجھے جلدی جانا ہے ۔ ورنہ ماسٹر صاحب غصہ کریں گے میں کل پھر تمہارے لئے مٹھائی لے آؤں گا اور سیکل پر چل دیا ۔ فاطمہ روتی ہوئی

مٹھائی کھاتی ہوئی بیٹھی رہی اندر سے اچانک ملازم باہر نکل پڑے آہ وزاری کرتے ہوئے اماں پھاٹک تک چلی آئیں عمران صاحب کہیں باہر گئے تھے فاطمہ پر نظر پڑتے ہی ملازمہ چلاّ پڑی "فاطمہ بی بی یہاں ہیں" پھر اُسے اٹھا کر اندر لایا گیا اماں نے سمجھا ہیں کہ یہ سب کیسے ہوا' اماں نے فاطمہ کو بڑے پیار سے سمجھا کر پوچھا کہ وہ باہر کیسے پہنچی تو فاطمہ نے ڈرتے ڈرتے اماں سے سارا واقعہ کہہ ڈالا' اماں حیرت کے عالم میں تھی کہ وہ آخر وہ کون لڑکا ہے جو اسے اس طرح بہکا رہا ہے بغاوت کی تربیت دے رہا ہے فرار کا طریقہ سکھا رہا ہے ؟ فاطمہ نے کہا وہ کل پھر میرے لئے مٹھائی لے کر آئے گا آپ اس کو بلا کر نام پوچھئے اور ملیدہ بھی کھلایئے ۔ اماں نے دانت پیستے ہوئے کہا ہاں.... ہاں.... ملیدہ ! اور پھر دوسرے دن سب گھر والے مقررہ وقت چھپ کر بیٹھ گئے سب کی آنکھیں راستہ پر لگی تھیں کہ اب لڑکا آتا ہی ہوگا فاطمہ کو باہر بٹھا دیا گیا تھا جیسے شیر کے شکار کے وقت گائے کو باندھا جاتا ہے وہ اسے تنہا سمجھ کر مٹھائی د... دیگا تو ملازم پکڑلیں گے ۔ آخر کچھ دیر بعد ایک سیکل نظر آئی جس پر اسی رنگ کی ... پہنے ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص بیٹھا تھا وہ فاطمہ کے قریب آیا اور جیب سے پُڑیا نکال کر دیتے ہوئے بولا "میرا نام توفیق ہے" اور آگے بڑھ گیا ملازم اسے راہ گیر سمجھ کر چپ رہا لسے تو لڑکے کی تلاش تھی یہ تو بڑی مونچھوں والا آدمی تھا ۔ کاغذ میں بندھی مٹھائی وہی مٹھائی تھی جو دو دن سے فاطمہ کو کھلائی جا رہی تھی اب بھی فاطمہ وہی مٹھائی کھا رہی تھی وہ بڑی مونچھوں والا در اصل وہ لڑکا ہی تھا جس نے اپنا نام توفیق بتایا تھا دہی نقلی مونچھیں لگا کر سب کی آنکھوں میں دھول جھونک گیا تھا ۔ اپنے بچپن کی باتیں یاد کرتے ہوئے فاطمہ بے اختیار ہنس پڑی وہ جب بھی اپنے بچوں کو ہدایت و توفیق کی دعا دیتی تو اُس کو توفیق کی یاد آہی جاتی جس کی دی ہوئی گڑ کی مٹھائی کا مزہ اب بھی یاد ہے ۔ - -

دھوپ

کڑی دوپہر میں، میں اپنی بالکنی میں کھڑی سنسان سڑک کا نظارہ کر رہی تھی بھری پری سڑکوں پر سہارا چلنا دوبھر ہو جاتا ہے لیکن سنسان سڑکوں پر ہم اپنی خواہش کے مطابق تصوراتی راہگیروں کو چلاتے لگتے ہیں، میں اس وقت عجیب طرح سے ٹھمکا لگا کر چلنے والی اس برقعہ پوش خاتون کی پشت دیکھ رہی تھی جس کے برقعہ پر ایک دل کی تصویر بنی تھی اور اس میں ایک تیر بھی پیوست تھا، برقعہ پوش خاتون کے چلنے کا انداز کہہ رہا تھا ـــــ

تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے، ـ ـ ـ

کچھ دیر بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں اس کے دل اور تیر کے بارے میں سوچنے لگی، لو چلنے کے اس موسم میں سنسان سڑک پہ تنہا برقعہ پوش خاتون کا یہ رومانٹک انداز مجھے الجھا رہا تھا میں باہر کے گرم منظر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بالکنی کے شیشے سے لگی کھڑی رہی،

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا سا نوجوان لڑکا اس بلڈنگ کے مین گیٹ کے پاس ایک کھلی جگہ میں ٹھہر گیا اور پلاسٹک کی تھیلی میں سے اس نے کچھ کالا سا کپڑا نکالا، اور پھر اسے پہن لیا، ارے، یہ کیا؟ یہ لڑکا اس خاتون کا برقعہ شاید چرا لایا تھا لیکن جب وہ وہاں سے چلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ برقعہ پہننے کے بعد یہ بالکل وہی خاتون لگ رہا تھا جسے میں کچھ دیر پہلے دیکھ چکی تھی، اس نے گیٹ سے باہر آ کر اپنی چال بدلی اور ٹھمک ٹھمک کر آگے بڑھنے لگا، دو تین آدمی کہیں سے اس کے پیچھے دوڑنے

آئے اور چور، چور، کہنے لگے، چور کا دل کمزور ہوتا ہے نا؟ وہ یہ بھول کر کہ وہ ایک خاتون بنا ہوا ہے، دوڑنے لگا، برقعے کا نقاب الٹ گیا اور پیچھے آنے والے لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور مارنے لگے، لڑکا گڑگڑانے لگا میری ماں بہت بیمار ہے اسے دوا کی سخت ضرورت ہے، دو دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا تو میں کیا کرتا؟ ان لوگوں نے اس کے ہاتھ سے چوری کیا ہوا پاکٹ چھین لیا اور مار پیٹ کر کے چلے گئے، لڑکا برقعہ ہاتھ میں لئے بہت مغموم ٹھہرا ہوا تھا، میں نیچے اتر گئی اور اس سے کہا، اپنی ماں کے لئے چوری کر رہے ہو؟ تو لڑکے نے کہا، ہاں! کیا کروں؟ میں نے کہا یہ لو یہ پیسے، اور ابھی ماں کی دوا لے لو، اور پھر میرے پاس آؤ میں تمہیں نوکری دلوا دوں گی، لڑکے نے کہا، میں بھیک نہیں لیتا میں محنت کی روٹی کھاتا ہوں چوری میں بھی تو محنت کرنی پڑتی ہے اور پھر یہ میری ماں کا برقعہ مجھ پر سایا کئے رہتا ہے، میں پکڑے جانے سے ڈرتا نہیں، میرے والد ٹیلر تھے انھیں کے ہاتھ کا سیا ہوا یہ برقعہ ہے یہ ڈیزائن بھی انھوں نے بنایا تھا جو کالج کی لڑکیوں میں بہت مقبول ہوا، میرے والد پچھلے فسادات میں مارے گئے تب سے ہی میں اپنی بیمار ماں کا آسرا بنا ہوا ہوں اور میری ماں نے بغیر محنت کی روٹی کھانے اور کھلانے کو منع کر رکھا ہے، یہ کہہ کر وہ لڑکا میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، وہ تیر جو برقعے کی پشت پہ بنے دل میں پیوست تھا اب میرے دل میں منتقل ہو چکا تھا میں نے غضب ڈھاتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا تو اس کی پیشانی سے چند پسینے کے قطرے میری پلکوں پر گر پڑے اور میں واپس اوپر چلی آئی، چلچلاتی دھوپ نے بادل کے آنچل میں ندامت سے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔۔۔۔۔!

"سوال.....!"

"ببیا" بڑے ٹھاٹ سے گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی تھی ماتھے کا جھومر جگمگا رہا تھا کانوں میں لرزتے لگے بُندے ذرا سی جنبش سے لرزنے لگتے تھے بیگمات کی طرح بیٹھنے والی "ببیا" شجرفی رنگ کے گھیردار فراک پر زرد دوزی کے کام والی سیاہ صدری پہنے مغلیہ دور کی یاد دلا رہی تھی اس سات سالہ "ببیا" نے اپنی سلطنت پر اپنا سکہ جما رکھا تھا ہمیشہ اپنی سہیلیوں میں نمایاں اور رعب دار رہی تھی آج جھانسی کی رانی کا دربار جما ہوا تھا "ببیا" جھانسی کی رانی بنی بیٹھی تھی آس پاس اس کی ہم عمر سہیلیاں تابعدار کنیزیں بنیں کچھ پنکھا جھل رہی تھیں کچھ "ایک تارا" لئے تار جھنجھنا رہی تھیں اچانک اماں کی آواز آئی۔ ببیا! یہاں آنا بیٹی تمہارے لئے ملیدہ بنا ہے سہیلیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا لو! ببیا جھلا گئی ہونہہ — کہیں جھانسی کی رانی کبھی ملیدہ کھاتی ہے؟ ببیا پھر بھی بے اختیار ماں کی سمت دوڑ پڑی۔ اماں نے ملیدے کا تھال اس کے ہاتھ میں دے دیا خوش نظر (خادمہ لڑکی) پیچھے دودھ کا جگ اور چھوٹے چھوٹے خوب صورت گلاس کشتی میں رکھے چلنے لگی سہیلیوں نے پنکھے اور ایک تارے پھینک دئے اور لگیں ملیدہ پر ہاتھ مارنے، ببیا بہت خوش ہو گئی اس کی سہیلیاں ملیدہ

کھاتی ہوتی اسے بہت اچھی لگیں اسے ہمیشہ کسی کو کھاتا دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ اس کو بھوک نہیں لگتی تھی خوشی سے ہمیشہ پیٹ بھرا رہتا، اماں بادام کی مٹھائی اور مگت کے لڈو ہمیشہ گھر میں تیار رکھتیں اور کسی نہ کسی بہانے ببیا کو کھلاتی رہتیں ملیدہ کا دور ختم ہوا تو دودھ جس میں بادام اور پستے پیس کر ملائے گئے تھے گلاسوں میں تقسیم ہوا، اماں کا کہنا تھا کہ ملیدہ پر دودھ ضرور پینا چاہئے ورنہ ملیدہ حلق میں پھنسا رہتا ہے۔ ببیا کا دل ملیدہ کے بعد اچانک حاتم طائی بننے کو چاہا اسنے دوپٹہ کا شملہ بنایا گلے سے موتیوں کا ہار نکال کر شملہ پر سجا دیا جھومر کو بھی سامنے لگا دیا اور ایک پنسل سے ہونٹوں کے اوپری حصے پر لکیر سی کھینچ دی یعنی کہ حاتم طائی کی مونچھیں، ایک سہیلی کو گھوڑا بنا دیا دوسری سہیلی کا دوپٹہ موڑ کر کوڑا بنا ڈالا اور دینے لگی گھوڑے کو شپ اشپ گھوڑے کی پیٹ پر کوڑا برسا تو کچھ نہ ہوا لیکن جب ایک کوڑا کسی طرح گھوڑے کے منہ پر پڑا تو گھوڑے نے ہنہنا کر حاتم طائی کو گرا دیا اور گھوڑا بننے والی لڑکی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے زور سے آواز نکال کر رونے لگی خوش نظر نے دیکھا کہ جس دوپٹے کا کوڑا بنا تھا اس کے کناروں پر گوپ کردکا گوٹہ لگا تھا جو گھوڑا بننے والی لڑکی ہاجرہ کی آنکھ میں لگ گیا آنکھ سے خون بہہ رہا تھا ہاجرہ زار زار رو رہی تھی سب ہی لڑکیاں سہم گئیں لیکن ببیا نے ہمت نہ ہاری روتی ہوئی ہاجرہ کے ہاتھ میں اپنے دونوں کانوں کے بندے اتار کر رکھ دئے اور لگی چپ کرانے "میری بہنا! میری پیاری بہنا! اب میں گھوڑا بنتی ہوں تم مجھ کو کوڑا مارو" ببیا رو رو کر ہاجرہ

کی منت کرنے لگی ہاجرہ کی سسکیاں کم ہوئیں لیکن آنکھ زخمی ہو چکی تھی اس کا گھر قریب تھا وہ بیبیا کے بُندے لے کر کچھ کہے بنا سسکتی ہوئی چلی گئی۔ بیبیا رو رہی تھی دوسری سہیلیوں نے اُسے سمجھایا کہ ایک سہیلی گئی تو کیا، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں تم ہم کو کوڑا مارنا، مگر حساس بیبیا راضی نہ ہوئی آخر کچھ دیر بعد جب رونا دھونا کم ہوا تو جھولا جھولنے کی سوجھی گھر کے دالان میں جھولا بھی تھا بیبیا نے حکم دیا کہ پہلے جھولے کو پھولوں سے سجایا جائے باغ سے پھول توڑے گئے جھولے کی زنجیریں پھولوں سے سجائی گیں اور بیبیا جھولے پر بیٹھ کر پینگیں بڑھانے لگی ساتھ ساتھ دھیمے سروں میں گاتی بھی جارہی تھی سے جھولے میں پون کے آئی بہار..... ہو..... خوش نظر ڈھولک اٹھا لائی اب اس نے تان اٹھائی آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم ــ تم ملے تو ویرانے میں آجائے گی بہار...... آآ آ... بیبیا کی پینگیں تیز ہونے لگیں سہیلیاں تالی پہ تالی بجانے لگیں اچانک بیبیا کے فراک کی لمبی آستین کسی طرح جھولے کی زنجیر میں اٹک گئی اس کو نکالنے کی کشمکش میں بیبیا وزن نہ سنبھال سکی اور دھڑام سے نیچے گر پڑی مہین آستین کا کچھ حصہ زنجیروں میں الجھا رہ گیا۔ بیبیا کی سہیلیوں نے بھی کہرام مچا ڈالا اتنا شور سن کر اماں دوڑی آئیں ہائے، میری بچی کو کیا ہوا؟ خوش نظر نے بادیدہ نم سارا قصہ سنا ڈالا۔ بیبیا کی ناک سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ مطمئن تھی وہ اماں سے کہنے لگی اماں آپ کہتی تھیں نا؟ جو دوسروں کو بلاوجہ دکھ دیتا ہے خدا اس کو ضرور سزا دیتا ہے ہاجرہ کو کوڑا مارنے کا واقعہ اس نے آنسوؤں کے درمیان سنا ڈالا

اور اس صبر کے ساتھ کہ اماں مذہب کی آہنی پابند ہونے پر بھی بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا۔ یا اللہ! میری معصوم بچی پر یہ کیسا ستم ہے؟

ببیا اماں کی بات کو جھٹلا رہی تھی وہ بڑی ببیا کی سے کہہ رہی تھی، "میں نے ہاجرہ کو تکلیف دی تو مجھے بھی چوٹ لگی اس کا خون بہا تو میرا بھی خون بہا اماں آپ پریشان نہ ہوں میں اب نہ گھوڑے پر بیٹھوں گی نہ جھولے پر۔۔۔"

فجر کی اذاں ہو رہی تھی ببیا کا تکیہ وضو کر چکا تھا اس کا نام اب ببیا نہیں رہا تھا بلکہ کئی بچوں کی ماں شبہتاج دلہن کے خطاب سے جاتی جاتی تھی سسرال کے ستم اور شوہر کی خاموشی، رات آنکھوں میں کٹتی تکیہ بھیگتا یوں ہی شب و روز کا سلسلہ جاری تھا اس نے فجر کی نماز پڑھی اور معبودِ حقیقی کے آگے دستِ سوال پھیلا دیا جس میں صرف ایک سوال تھا جب میں نے کسی کو دکھ نہیں دیا یا رب؟ تو یہ سزا کیسی ہے؟ میں اندر اندر جلتی ہوں میں چپکے چپکے روتی ہوں میں سب کچھ سہتی ہوں آخر کیوں؟

صبح جلوہ گر ہو گئی۔ ببیا جانماز پر سجدے میں پڑی رہی بچے جاگے گھر کے سب لوگ جاگے امّی امّی! چھوٹی فرزانہ نے ماں کو سجدے سے اٹھانا ضروری سمجھا لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سجدے سے سر اٹھتا ہی نہیں، اور ایسا ہو چکا تھا، سب لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کیا ہوا۔۔۔۔۔۔؟ کیسے ہوا۔۔۔۔۔۔؟

نغمہ

باپ دادا کی نہ جانے کونسی پشت میں کوئی شاہی گویا رہا تھا اب بادشاہت تو نہیں رہی تھی لیکن یہ خاندان اب بھی نغمہ و سیاز کے شوقین لوگوں کی نگاہوں میں قدر سے دیکھا جاتا تھا منیر احمد خان کا گھرانہ کافی خوش حال تھا نغمہ اپنی امی کی سہیلی آنیسہ بیگم کی لڑکیوں سے کافی مانوس تھی انیسہ بیگم منیر احمد خان کی بیوی تھیں ان کی دو لڑکیاں ریحانہ اور فرحانہ نغمہ کی سہیلیاں تھیں ریحانہ کا سب سے بڑا بھائی بشیر عمر میں بہنوں سے کافی بڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بشیر کی پیدائش کے بعد تقریباً پانچ بھائی بہن انتقال کر چکے تھے انیسہ بیگم ایک عرصہ تک گم سم رہی تھیں اس کے بعد ریحانہ پھر فرحانہ پیدا ہوئیں تو کچھ بہل گئیں۔ محرم کی دس تاریخ تھی شہیدوں کی فاتحہ کی محفل تھی اور بھی کچھ نہ جانے کیا کیا اہتمام تھا سبز کپڑے، رنگین ڈوریاں گلوں میں اور کچھ زریں تار بھی گلے میں ڈالے جاتے تھے شہیدوں کے نام پر شربت تقسیم ہو رہا تھا منیر احمد خان کے پاس یوم عاشورہ کے موقع پر نغمہ امی کے ساتھ آئی ہوئی تھی سبز رنگ کا غرارہ سوٹ اور سیاہ اوڑھنی اوڑھے لڑکیوں کے ساتھ نغمہ بھی کھیل میں لگی تھی کھیلتے کھیلتے وہ یونہی ایک کمرے میں گھس گئی جہاں پر بشیر تنہا بیٹھا کینوس پر ایک تصویر بنا رہا تھا جہاں پر ایک سبز کپڑوں میں ملبوس لڑکی چبوترے پر بیٹھی تھی اس کے بال بے ترتیب اور کھلے ہوئے تھے بشیر بھائی! اس کا دوپٹہ آپ نے نہیں اڑھایا؟ نغمہ بولی بشیر نے پوچھا کس رنگ کا اتاروں؟ نغمہ نے کہا ہوئے کہا میرے جیسا! بشیر نے فوراً تصویر کے سر پر سیاہ دوپٹہ لہرا دیا اور پھر غور سے نغمہ کی طرف دیکھنے لگا!

چھوٹی سی چھ سات سالہ لڑکی نے اس کے فن کو تنقیدی نظر سے دیکھ کر مشورہ دیا تھا اور اس نے مان لیا اس تصویر میں نغمہ اتر آئی ...... نغمہ پھر کمرے سے چلی گئی ۔

کچھ دنوں بعد ریحانہ نے نغمہ سے اداس لہجے میں کہا کہ نغمہ! میرے بشیر بھائی بمبئی چلے گئے کبھی نہ آنے کے لئے، مگر کیوں؟ نغمہ حیران ہوئی اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں انگوٹھی پہنائی جائے مگر تمہارے ابا جان راضی نہیں ہوں گے کیوں کہ تم تو بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو نا! نغمہ بولی تو کیا ہوا میں انگوٹھی پہن لوں گی بھلا اس میں ابا جان کیوں راضی نہیں ہوں گے انگوٹھی مجھے ہاتھ میں پہننا ہے پہن لوں گی کیا بہت خوب صورت انگوٹھی ہے؟ نغمہ نے اشتیاق سے پوچھا ریحانہ نغمہ سے تین سال بڑی تھی کسی حد تک سمجھدار بھی بولی معلوم نہیں میں نے نہیں دیکھی ۔ چار دن سے نغمہ ریحانہ کے گھر میں ہی تھی یہاں گڑبڑ مچی ہوئی تھی خاندان کے کچھ لوگ بشیر کو واپس لانے بمبئی گئے ہوئے تھے بس آنے ہی والے تھے گھر والوں نے بشیر کی بات مان لی تھی ۔ رات کو تقریباً آٹھ بجے گھر میں دھوم مچ گئی بشیر بھائی آگئے ۔ بشیر آگیا .... وغیرہ وغیرہ نغمہ بھی دروازے کی طرف گئی دیکھا بشیر کی ماں بیٹے کے گلے لگ کر زار زار رو رہی ہیں آخر رونا دھونا کم ہوا نغمہ کی امی نے بشیر کی امی سے بات پکی کر لی نغمہ کے ابا کو بتائے بغیر ۔ اب اس فنکار گھرانے کے رواج کے مطابق نغمہ کی ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ پہنانا ضروری تھا اور نغمہ کی ناک میں سوراخ نہیں تھا لہٰذا مسند بچھائی گئی صندل کی کٹوری مٹھائی اور منہ جلانے کیا کیا کشتی میں

سجا کر رکھے گئے نغمہ کو مسند پر بٹھایا گیا بشیر فخریہ انداز میں ایک کونہ میں کھڑا ہوا تھا بشیر کی ماں نے پھر ایک بار بشیر کو سمجھایا بیٹا! لونڈیا بہت چھوٹی ہے تجھ سے؟ مگر بشیر کی ایک ہی لہر تھی ...... بس نغمہ ...... کوئی جلاد قسم کی خاتون آگے آ کر بیٹھ گئیں نغمہ کے گلے میں پھولوں کا ہار سہرا یا ڈھولک پر گیت ہونے لگے ..... چرا کر لے گیا ظالم میری زنجیر سے دے لی .... اور اس جلاد خاتون نے نغمہ کی ناک پر لگے نشان میں سوئی چبھو دی آ آ آ ..... ایک لرزا دینے والی چیخ نغمہ کے منہ سے نکلی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی، ڈاکٹر آیا، دوا دی مگر ہوش آنے کے بعد بھی نغمہ بات نہ کر سکی نغمہ کی امی پریشان ہو گئی اور بیٹی کو لے کر واپس گھر آ گئیں اور شوہر سے ماجرا سنایا کہ ناک میں نتھ پہننے کا شوق تھا ناک میں سوراخ کرنے سے یہ واقعہ ہو گیا خیر کافی علاج ہوا نغمہ صحت مند ہو گئی لیکن منیر احمد خان کے گھر آنا جانا بند ہو گیا انھیں لوگوں نے ترکِ تعلق کر لیا تھا بشیر گھر سے پھر فرار ہو گیا تھا ...... کئی برس بعد اسٹیج پر غزل گاتے ہوئے بشیر کی نظر نغمہ پر پڑی جو اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی غور سے غزل سن رہی تھی نغمہ اسے پہچان نہ پائی مگر بشیر جو ایک بڑا فن کار تھا غزل گاتے گاتے رک گیا غزل کی لئے ٹوٹ گئی ساز رک گئے اس کی نظریں نغمہ پر جمی تھیں۔ محفل میں موجود لوگ بھی نغمہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسی ہنگامے میں چپ چاپ اعجاز اپنی بیوی نغمہ کو اپنا کوٹ پہنا کر دنیا کی نظروں سے بچا کر گھر لے آئے ....

"کہانی"

سانپ کا زہر بے شک سریع الاثر ہوتا ہے، کبھی کبھی تو بچھو کے ڈنک مارنے سے بھی موت واقع ہو جاتی ہے، مگر ماضی کی یادیں سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے انسان اندر ہی اندر جیتا ہے اندر ہی اندر مرتا ہے۔

اماں! کہانی سناؤ نا! ننھی نفیسہ چہکی، اماں بستر پر لیٹ گئیں تو نفیسہ نے اماں کا ہاتھ لے کر اپنا تکیہ بنا لیا اور ان کے کاندھے پر اپنا چہرہ رکھ دیا اماں! وہی کہانی سناؤ نا، پری والی، جس کو لینے کے لئے ایک شہزادہ برسوں جنگل میں مارا مارا پھرتا ہوا، صحرا، صحرا سفر کرتا ہوا اس قلعے کے پاس پہنچ جاتا ہے جہاں ایک پنجرے میں پری قید ہوتی ہے اور جس کی حفاظت خطرناک دیو کرتا ہے..........

نفیسہ نے اماں کو کہانی یاد دلاتے ہوئے اصرار کیا تو اماں شروع ہو گئیں: "بھئی، آنکھوں دیکھی کہتی نہیں، کانوں سنی کہتی ہوں، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ اس کا ایک حسین بیٹا تھا۔ شہزادہ خرم۔ اس نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ ایک خوب صورت پری پنجرے میں بند ہو کر شہزادی کو اپنے پاس بلا رہی ہے، پنجرے کی سلاخیں جھنجھوڑ رہی ہے، شہزادہ جاگ پڑا اور اپنے گھوڑے پر نکل گیا، جنگل جنگل خاک چھانی، بھوکا پیاسا دھوپ میں جلتا ہوا اندھیرے میں بھٹکتا ہوا، وہ

ڈھونڈھ رہا تھا جس میں حسین "پری" اُسے بلا رہی تھی وہ آخر قلعے کے دربانوں سے لڑتا ہوا، ہاتھ میں تلوار تھامے قلعے کے اندر گھس پڑا آخر ایک جگہ اسے وہ پنجرہ نظر آ گیا، جہاں پری قید تھی خوب صورت پری کے پروں میں طاقت پرواز اتنی نہیں تھی کہ وہ پنجرہ لے اڑتی، دیو نے جب شہزادے کو اپنی طرف آتا دیکھا تو اپنے ہاتھ کا چابک فضا میں لہرا کر شڑاپ، شڑاپ کرنے لگا........ نفیسہ کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ کہانی سنتے سنتے ہی سو گئی۔ ـــــــــ

صبح ہوئی تو ناشتے کے بعد پھر نفیسہ کہنے لگی، اماں، مجھے پوری کہانی سناؤ نا؟ نہیں بیٹی، کہانی دن میں سنائی جائے تو مسافر راستہ بھٹک جاتے ہیں، میری پری بیٹی! اماں نے پیار سے کہا، اماں! میں پری ہوں تو میرے پر کیوں نہیں ہیں؟ نفیسہ پوچھ بیٹھی جب تو بڑی ہو جائے گی نا! تب پر آ جائیں گے، اماں نے سمجھایا، تو اماں! وہ شہزادہ کہاں ہے جو مجھے لینے آئے گا اور وہ دیو کہاں ہے جو مجھے قید کرے گا؟ نفیسہ کے معصوم سوالوں کا جواب اماں کا کمزور دل نہیں دے سکتا تھا، انھوں نے دوسری باتوں میں اس کا دھیان بٹا دیا۔ نفیسہ سیانی ہو چلی تھی مگر کہانی سننے کا شوق کم نہ ہو سکا، وہ اب بھی اماں کے ہاتھ کا تکیہ بنا کر ان کا چہرہ تکتے ہوئے کہانی سنتے سنتے سو جاتی۔ نفیسہ کے معصوم ذہن میں ہاتھ میں تلوار لیے اس کو تلاش کرنے والا شہزادہ مسلسل جنگلوں میں بھٹک رہا تھا، صحرا اور سمندر کا سفر کر رہا تھا پھر اماں نے نفیسہ کی شادی کر دی، ان کی صحت بگڑنے لگی تھی اور ایک دن وہ آخر چل بسیں،

نفیسہ اپنی دادی ساس کے ہاتھوں کو تکیہ بنا کر لیٹ جاتی اور کہانی سنتی رہتی،

دادی ساس اس سے بہت محبت کرتی تھیں ایک دن اس طرح رات کو وہ دادی ساس کے ہاتھ پہ کہانی سنتے ہوئے سوگئی، نفیسہ کے شوہر نے بیوی کی تلاش شروع کی وہ کمرے میں نہیں تھی تو آخر گئی کہاں؟ گھر حویلی کی طرح بہت بڑا تھا ہر جگہ ڈھونڈا، مسلسل گڑبڑ سے دادی ماں کی آنکھیں کھلی تو دیکھا، بہورانی ننھی منی بچی کی طرح ان کے ہاتھ پر سو رہی ہے انھیں نفیسہ پر بہت پیار آیا پھر آہستہ سے جگاکر کہا "جاؤ اپنے کمرے میں جاکر سو جاؤ" وہ ہڑبڑاکر اٹھ بیٹھی پھر اپنے کمرے میں چلی گئی، دیکھا تو ہر شخص پریشان نظر آیا نفیسہ کو دیکھتے ہی ساس نے پوچھا، کہاں تھیں تم؟ جواب ملا، دادی ماں کے پاس کہانی سنتے سنتے سوگئی تھی، تمہیں شرم نہیں آتی اتنی بڑی ہوکر بچیوں کی طرح کہانی سنتی ہو؟ نفیسہ کے شوہر نے بیچ میں آکر بات ختم کی، ساس صاحبہ مسلسل بولی جارہی تھیں، ہونہہ کوئی اس عمر میں کہانیاں سنتا ہے؟ یہ عمر تو ساس، سسر کی خدمت کرنے کی ہے، بچے نہیں تو کیا، ہو ہی جائیں گے، نفیسہ آزردہ سی سنتی رہی، عورت تو اس وقت سے عورت ہوتی ہے جس گھڑی وہ پیدا ہوتی ہے، اسے ہمیشہ خواہشات گھیرے رہتی ہیں، کبھی گڑیوں کا شوق، کبھی زیور کا شوق، کبھی سجنے سنورنے کا شوق، کبھی گانے بجانے کا شوق، لیکن اس کے حصے میں قربانیاں ہی آتی ہیں، اس کے باوجود سماج ایک دیو کی طرح عورت کو قید میں رکھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

دوسرے دن صبح پھر ساس صاحبہ نے بکواس شروع کردی اور نفیسہ سے کہا دیکھو بہورانی! اب تم یہ کہانیاں، وہانیاں سننے کا ڈھونگ چھوڑ دو، اور گرہستن عورتوں کی طرح اپنا دل کام میں لگاؤ، آخر تمہاری نندیں کب تک نوکرانیوں کی طرح کام کاج میں لگی رہیں گی؟ انھیں کیا تم نے خرید لیا ہے؟ تمہارا فرض ہے گھر کا کام کاج

کرنا" اور بچپنا چھوڑو یہ کہانیوں کا شوق، یہ گڑیوں کا شوق چھوڑو، تم بچی نہیں ہو، دن بھر گڑیوں کو سنوارتی رہتی ہو جیسے تمہیں اس گھر میں اسی لئے لایا گیا ہو میں آج ہی ان گڑیوں کو پڑوس کی غریب لڑکیوں میں بانٹ دوں گی" نہیں، ہرگز نہیں نفیسہ چیخ پڑی، پری کے پر نکل آئے، میری گڑیوں کو کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔

ساس بیگم کے ماتھے پر سانپ لہرانے لگے فوراً جاوید کو بلایا اور کہا دیکھو تمہاری دلہن کتنی منہ پھٹ ہوگئی ہے، مجھے جواب دے رہی ہے جاوید نے نفیسہ کو ڈانٹ کر کہا، امی جان جو کہیں تمہیں وہی کرنا ہے اپنا کام کرو بے کار وقت ضائع مت کرو، بچپن کے دن نہیں جو ہنس کھیل کر گذارے جائیں ------

نفیسہ اپنے کمرے میں جاکر خوب روئی اسے لگا کہ یہ کمرہ وہی پنجرہ ہے جس میں کہانی والی "پری" قید تھی، جاوید وہی جلّاد "دیو -------! مگر اسے ڈھونڈتے ہوئے برسوں کا سفر طے کرکے آنے والا شہزادہ کہاں ہے ؟ کسی نے دن میں کہانی تو نہیں کہہ ڈالی، مسافر راستہ تو نہیں بھٹک گیا -----؟

اب بھی روز شام کو نفیسہ چھت پر جاکر ایک چراغ جلا کر رکھ دیتی ہے اس امید پہ کہ اگر شہزادہ بھٹک رہا ہو تو یہ روشنی دیکھ کر اس کے پاس چلا آئے گا !!!

شعلوں کے درمیان

اس مرتبہ باہر دیوالی کے سارے دیپ پانی سے بھر چکے تھے کوئی چراغ بھی روشن نہیں تھا۔ جہاں پانی ہو وہاں شعلے نہیں ہوتے اور جہاں شعلے نہیں ہوتے وہاں روشنی بھی نہیں ہوتی لیکن پشپا کے دل کے اندر اجالے ہی اجالے تھے اس کی تمناؤں کے سب ہی دیپ جگمگا رہے تھے ماجد کے لئے اس نے مٹھائی کا تھال سجا رکھا تھا وہ بہت دیر سے اس کی منتظر تھی بارش کے قطرے سڑک پر لگے سرکاری بلبوں کی وجہ سے دیپ بن کر جگ مگ کر رہے تھے آتشبازی کی ناکام کوششیں جاری تھی۔ بارش ہر چند کہ بہت دھیمی تھی لیکن چراغاں کسی صورت ممکن نہ تھا دھماکے دار پٹاخے سرد آہیں بھر کر بجھے جا رہے تھے عمارتوں کے اندر کی روشنی سے بستی کے بیدار لوگوں کا اندازہ کیا جا سکتا تھا کہیں دور کوئی گانے کی آواز ہوا کی لہر سے سنائی دے رہی تھی ؎

"میلے ہیں چراغوں کے رنگین دیوالی ہے"

لیکن ماحول برعکس تھا دیوالی اس بار رم جھم برکھا ساتھ لے کر آئی تھی فضائیں مٹی اور پانی کی ملی جلی خوشبو کے ساتھ مٹھائیوں کی خوشبو بھی شامل تھی رات کے نو بج رہے تھے ابھی تک ماجد نہیں آیا۔ دیوالی کی ہر رات ماجد جی بھر کے

مٹھائی کھانے کے لئے "چاچی" کے گھر آیا کرتا تھا یہ سلسلہ برسوں سے جاری تھا چاچی کی بڑی لڑکی پشپا سرسوتی جیسی آنکھوں والی ماجد کو بہت پسند کرتی تھی پسند کے درمیان نہ مذہب ہوتا ہے نہ کوئی عہدہ، ایک ہی محلہ" بچپن کا ساتھ، بہر حال نقش تو دھندلے نہ تھے یہ الگ بات تھی کہ ماجد بالکل الگ سی دنیا میں رہنے والا تھا لیکن دیوالی کے شبھ اوسر پر چاچی کے گھر مٹھائی کھانے ضرور جاتا تھا رات آگے بڑھ رہی تھی بارش ہلکی پھوار بننے لگی تھی آتشبازی میں بھی اب کچھ زور سا آنے لگا کہیں کہیں ہوائی راکٹ آسمان پر رنگ برنگے جگمگاتے منظر بناتے جا رہے تھے گیٹ والے مکانوں کے چھوٹے بڑے لانوں میں تارے برساتے ہوئے انار کبھی کبھی آتش فشاں کے انداز میں پھٹ رہے تھے پھر بھی مجموعی اعتبار سے آج آتشبازی کچھ "سرد" سی تھی۔

ماجد ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ پشپا دل ہی دل میں پریشان ہو رہی تھی گھر کے بڑے ہال میں "تاؤجی" اپنی فیملی کے ساتھ برِج بازی پر بازی لگائے جا رہے تھے۔ ڈیرن (پشپا کی چھوٹی بہن) خواہ مخواہ بھائیوں سے الجھی جا رہی تھی بالآخر گیٹ کے پاس موٹر سیکل کی آواز سنائی دی یہ گاڑی ماجد ہی کی تھی ماجد بے تکلف اندر چلا آیا ہاتھ جوڑ کر سب کو نمستے کی اور چاچی کے گلے لپٹ گیا چاچی نے آواز دی" اری پشپا دیکھ ماجد آیا ہے جلدی سے مٹھائی لا!

پشپا چلائی ہاں ماں! ابھی لائی پشپا کو لگا جیسے سارا عالم

دیپ بن گیا ہو صحن کے اس پار والے کمرے سے پشپا نکل رہی تھی اُسی وقت اس کی تایا زاد بہنوں، بھائیوں نے کئی انار جما کر ایک دم سے جلا دیئے پشپا بے قرار تھی جلدی میں تھی اس آگ کے دریا سے گذر جانا چاہتی تھی مٹھائی کا تھال ہاتھ میں لئے وہ بیچ سے نکلی اسی لمحے اس کے بسنتی آنچل کو شعلوں نے پکڑ لیا ہر طرف انار دہک رہے تھے تارے ٹوٹ رہے تھے بسنتی آنچل کبھی آنچ دینے لگا پشپا کی چیخ بچوں کے شور میں دب کر رہ گئی اناروں کے بجھنے تک کوئی آگے کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا انار بجھ گئے پشپا جلنے لگی مٹھائی کا تھال دور جا پڑا پشپا زمین پر تڑپ رہی تھی وہ بجھنے ہی والی تھی سارا گھر دوڑ پڑا اور ماجد بھی۔ ڈوبتی ہوئی آواز میں پشپا نے ماں سے کہا ماں! مجھے دفن کرنا ماجد کے آبائی قبرستان میں.........!!!

"لمحوں کا سفر"

گاؤں کے مکانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں سے اور اندھیری گلیوں سے گھبرا کر نورالاسلام نے لڑکپن میں ہی شہر کے اجالوں کی طرف چھلانگ لگا دی اور وہیں اپنی باقی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ گاؤں میں بچپن ہی کے زمانے سے وہ شاہدہ بیگم سے منسوب کر دیئے گئے تھے جو ان کے اموں کی لڑکی تھی۔ شہر میں تعلیم کے دوران والد کا خط ملا کہ ان کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے وہ فوراً چلے آئیں نورالاسلام گاؤں پہنچے، قرابت داری میں رشتے طے ہوں تو ہونے والی دلہن کو دیکھ لینا قدامت پسند گھرانوں میں آسان ہو جاتا ہے۔ شاہدہ بیگم کا رنگ، روپ نورالاسلام کو ایک ہی نظر میں بھا گیا اور اپنے ماں باپ کی پسند پر دل ہی دل میں خوش ہو گئے اور شادی ہو گئی۔ کچھ دن رسموں کی تکمیل میں گزر گئے پھر انھیں شہر یاد آیا وہ اپنی دلہن کو لے کر واپس شہر آ گئے تعلیمی زینے پہلے وہ ایک ایک کر کے چڑھتے رہتے تھے۔ اب دو، دو، تین، تین سیڑھیاں پھلانگنے لگے اسی دوران انھیں کچھ شاعری کا شوق بھی ہو گیا کسی استاد نے سرشار تخلص عنایت کر دیا اور پھر یہاں سے نورالاسلام کا سرشار کی حیثیت سے کامیاب راہوں کا سفر شروع ہو گیا۔ ابتدائی دور ہی سے کامیابی قدم چومنے لگی اور شاعری کی داد بھی خوب ملنے لگی پھر پرستاروں میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ایک رسالہ کے ایڈیٹر بھی ہو گئے کامیابیاں کبھی کبھی انسان

کے حق میں حادثہ بھی بن جاتی ہیں ان کی غیر معمولی کامیابی نے انھیں ایک ادبی
گھرانے سے متعارف کرایا جہاں افضل صاحب کی اکلوتی بیٹی جوانی میں ہی بیوہ ہو چکی تھی
شوہر نے داغِ مفارقت کے ساتھ ایک لڑکی بھی بطور یادگار چھوڑی تھی سرشار صاحب کا
اس گھرانے میں کافی آنا جانا تھا اور بہت ہی بے تکلفی تھی ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں
سے زندگی کا ایک اور باب کھلنے والا ہے کبھی کبھی لمحاتی لغزش عمر بھر کی سزا ہو جاتی ہے
عارفہ اور سرشار صاحب کے درمیان "کیوپیڈ کا تیر" خون سے تربتر پڑا ہوا تھا۔
سرشار صاحب نے اپنے ایک خاص دوست کو راز دار بنایا اور مسئلہ سامنے رکھ دیا
دوست کا فیصلہ ظاہر ہے کہ دوست کے حق میں ہی ہوتا ہے سرشار صاحب نے
عارفہ سے خفیہ طور پر نکاح کر لیا پہلے شوہر کی بیٹی نسیم کی سرپرستی بھی باپ بن کر کرنے لگے
اور اپنی پہلی بیوی شاہدہ سے ہونے والے پھول جیسے بچوں کے لئے بھی کوئی کوتاہی نہیں کی
کئی برس گذر گئے، عارفہ سے بھی انھیں ایک لڑکی شمیم ہو چکی تھی۔ نہ جانے کس طرح ان
کی دوسری شادی کے چرچے ہونے لگے جب شاہدہ بیگم کو معلوم ہوا تو انھوں نے وہی
کیا جو ایک سلیقہ مند، سمجھدار، نیک اور خوب صورت بیوی کرتی ہے یعنی کہ "صبر"
سرشار صاحب نے مجرم کی طرح بیوی کے سامنے دوسری شادی کا اعتراف کر لیا
اور اس اعتراف نے انھیں اور بھی بلند کر دیا۔ شاہدہ بیگم "شوہر کی رضا پر راضی"
رہنے لگیں، مگر اس سے کیا ہوتا ہے ؟ سرشار صاحب کی مصروفیات نقطۂ عروج
پر تھیں کسی شعر و ادب کی محفل کی ایک شاعرہ شہناز کو دیکھا اور متاثر ہو گئے بے
چارے شاعروں کے دل ہوتے ہی بڑے نازک ہیں۔ ان پر حالات کا بڑا اثر
ہوتا ہے اس لئے ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، دونوں بیویاں ذہن سے نکل کر گھروں
میں ہی رہ گئیں اور شہناز دل و دماغ میں چلی آئی یونہی کچھ عرصہ گذر گیا مگر کب تک ؟

شہناز کی ماں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ دو بیویاں جس کی پہلے سے موجود ہوں میں اپنی بیٹی اسے کیسے دے سکتی ہوں؟ آخر ایک معقول جگہ رشتہ طے ہو گیا اور شہناز کی شادی ہو گئی سرشار صاحب نے گویا قیس و فرہاد کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، محبت کی محرومی سے شاعری میں نکھار آ گیا انھوں نے شہناز کو بھولنے کی ہر ممکنہ کوشش کی مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" شہناز شوہر کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی مگر کیا کیا جائے اس معجزہ کو کہ کبھی جسم سے دور جانے والے لوگ بھی دل کے اندر رہ جاتے ہیں، بظاہر رشتے بن نہیں پاتے مگر بڑے مضبوط حصار میں قید ہو جاتے ہیں سرشار صاحب نے اپنے کو بہت مصروف کر لیا کہ شہناز کا خیال ہی نہ آئے مگر انسان کی زندگی میں دل کا اہم رول ہوتا ہے جو زندگی کا سبب سمجھا جاتا ہے اس دل میں جو تصویر ہوتی ہے وہ بے جان اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ دل دھڑکنا نہ بھول جائے۔

ادھر شاہدہ بیگم شوہر کی مصروفیت اور لاپرواہیوں کے باوجود اپنے آپ کو سمیٹ کر بڑے ضبط کے ساتھ زندہ رکھنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں بچے سب بڑے ہو چکے تھے اور شاہدہ بیگم رفتہ رفتہ دائم المریض ہو گئیں۔

عارفہ کی تنک مزاجی سرشار صاحب کو پریشان کرنے لگی تو انھوں نے عارفہ کے یہاں آنا جانا کم کر دیا وہ دونوں بیویوں کو علیحدہ گھروں میں رکھتے تھے، عارفہ کسی اسکول میں ٹیچر ہو گئی ایک دفعہ سڑک پار کرتے ہوئے کسی تیز رفتار گاڑی کا کی زد میں آ گئی سڑک پر خون بہنے لگا لوگ جمع ہو گئے پولس آئی قاعدے قانون کے مطابق دواخانہ لے جایا گیا مگر عارفہ کی روح راستے میں ہی پرواز کر گئی سرشار صاحب دفتر سے دوڑے آئے اور عارفہ کی میت کو بڑے ناز سے کاندھا دیا جیسے کوئی

ابھی ابھی بیاہ کر لائی ہوئی دلہن کی ڈولی جیسے ---

کچھ دن بیت گئے سرشار صاحب کے دل و دماغ پر عارفہ کی موت کا غم نہیں بلکہ شہناز کی جدائی کا غم اب بھی شدت سے طاری تھا وہ مصروفیتوں میں گھر گئے ہر ایک کے کام آنا ان کا فرض اولین ہو گیا ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش زور پکڑتی گئیں خوشیاں بانٹنے کا کام ان کی سانسوں میں شامل ہو گیا وہ جانتے تھے کہ خوشی کیا ہوتی ہے اس دوران ان کی کئی کتابیں چھپ چکی تھیں ۔ ان کی تصویریں اخباروں میں آتی رہتیں کوئی محفل ان کے بغیر نہ ہوتی مگر ان کی اضطرابی کیفیت کم نہ ہو سکی ———

شاہدہ بیگم بہت سخت بیمار ہو گئیں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ۔ وہ بستر مرگ پر تھیں ہاتھوں میں چوڑیاں اور مہندی لئے سہاگن مرنے کی آرزو کرتی ہیں شاہدہ بیگم کی آرزو بھی پوری ہونے ہی والی تھی اچانک ایک رات سرشار صاحب بے قرار سے اپنے کمرے سے نکلے اور شاہدہ بیگم کے سرہانے بیٹھ گئے دھیرے سے پیشانی پر ہاتھ رکھا شاہدہ بیگم نے برسوں بعد شوہر کو مہربان دیکھا تو بے ساختہ مسکرا پڑیں سرشار صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اسی عالم میں صبح ہو گئی کوئی آنسو بہاتا رہا کوئی مسکراتا رہا، دوسرے دن شاہدہ بیگم کی میت کو محلے کی خواتین بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں مسکراہٹ ان کے چہرے پر جم گئی تھی بالکل اسی طرح جیسے سرشار صاحب کی لبریز آنکھیں، جن کی دھار میں شہناز کی تصویر بہہ چکی تھی اور شاہدہ بیگم کی مسکراہٹ جگمگا اٹھی تھی — — — — —

نظارۂ بہار

سورج کے دیوتا نے کرنوں کے تیر برسانے شروع کر دیئے تھے جو ادھ کھلی کلیوں کے سینے میں پیوست ہو کر خوشبو کے گیت بلند کر رہے تھے "دامنِ دل جنوں کے تاروں کی طرح ہر طرف خوشبو پھیلی ہوئی تھی میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی صحن کا نظارہ کر رہی تھی، جہاں صبح کی اولین ساعتوں کے لمس نے صحن میں لگے پودوں کو گدگدا دیا تھا، پتہ پتہ مسکرا رہا تھا ڈال ڈال جھوم رہی تھی، میں اپنے ماضی میں پہنچ گئی، جو اسی منظر کی طرح حسین تھا مجھے میرے ابا جان اپنے ساتھ دفتر لے جایا کرتے تھے جو شہر سے کافی دور مضافاتی علاقے میں تھا اور وہیں ایک یونیورسٹی کی عمارت بھی تھی ساتھ ہی کئی باغات بھی تھے میں ان ہی باغوں میں چلی جاتی، کبھی کانٹوں کی باڑھ پھلانگ جاتی اور پھولوں کے کنج میں جا بیٹھی، کبھی کسی آہنی گیٹ پر چڑھ کر صحنِ گلستان میں کود جاتی اور اپنے دامن میں قسم قسم کے پھول توڑ توڑ کر بھر لیتی اور پھر واپس آکر اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیتی، کبھی ان تتلیوں کا پیچھا کرتی جو رنگوں سے آراستہ مخملی وجود لئے پھولوں کا رس لینے کے لئے غنچوں پر رقصاں رہتیں، مجھے بھونروں سے ڈر لگتا ہے، اب بھی ڈرتی ہوں اگر میں سیرِ چمن میں مصروف ہوتی اور کوئی بھونرا گنگناتا قریب سے گزرتا تو میں چلا دیتی میری آواز باغ کے کسی گوشے میں آرام کرتے ہوئے مالی کے کانوں میں

گونجتی اور یہ "محافظِ چمن" میری طرف دوڑ پڑتے، میں کانٹوں سے بچتے ہوئے پھولوں بھرا دامن لیے باڑھ پھلانگ کر واپس اپنی گاڑی تک پہنچ جاتی اور سارے پھول پچھلی سیٹ پر رکھ کر میں آگے والی سیٹ پر بیٹھ کر زور، زور سے ہارن بجاتی جسے سن کر ڈرائیور دوڑا آتا اور میں خود کو محفوظ سمجھنے لگتی اور بڑی فاتحانہ نظروں سے پچھلی سیٹ پر رکھے پھولوں کے اس ڈھیر کو دیکھتی جس میں ہر طرح کے پھول اور کلیاں اور کچھ کچھ کانٹے بھی ہوا کرتے تھے۔ وقت کا اندازہ کبھی کوئی نہ کر سکا۔ بہاروں میں گذر رہی تھی میں باغوں میں اچھلتی کودتی گنگناتی رہتی۔ نہ جانے کہاں سے کچھ گرم ہوا کے جھونکے چلے آئے وہ باغ وہ بہاریں وہ پھولوں کے ڈھیر، تتلیوں کا رقص، سب ہی کچھ جھلس گئے میرے ابا جان خزاں کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے تنہا چھوڑ کر چل بسے ماں تو پہلے ہی گزر چکیں تھے، ان کے بعد وہ راستہ مجھے کبھی دکھائی نہیں دیا جو پُر بہار باغوں کی طرف جاتا ہے، ہوا کبھی مہک کا احساس نہ دلا سکی تتلیاں رہی نہیں رقص کون کرتا؟ ہواؤں کی گرمی کم ہونے لگی رفتہ رفتہ ٹھنڈک بڑھتی چلی گئی کہیں سے بھٹکی ہوئی خنکی نے ہوا پر قابو پا لیا تھا اور موسم کو ٹھنڈا کر کے ماحول کو پُرسکون بنا دیا تھا میں اب نئے گھر میں تھی نئے لوگوں کے ساتھ ------

میں نے صحن میں چھوٹا سا باغیچہ لگا رکھا تھا جس کی باغبان بھی میں تھی، نگہبان بھی میں تھی کچھ نئے پودوں پر کچی کلیوں نے ڈیرا جما لیا تھا میں نے ہر پودے کا انتخاب یوں کیا تھا کہ ہر موسم میں کوئی نہ کوئی قسم کے پھول کھلے رہتے، رنگ برنگی تتلیاں پھر رقص کرنے لگیں لیکن بھونرے بھی بے شمار آنے لگے، میں جب بھونروں کو دیکھتی تو نہ جانے کیوں ایسا لگتا کہ انکی گنگناہٹ میں ایک ماتمی سی دھن سی ہے ان کے

سیاہ ہوا ان بکھر کر بکھرتے والے پھولوں کا غم مناتے محسوس ہوتے میں اپنے صحن کو نقصان کرتے ہوئے اپنے دامن کی طرف دیکھتی جس میں میرے دونوں پھول جیسے ننھے پھولوں کی طرح کھلے رہتے۔ ایک دن میں صحن میں یونہی پودوں کا جائزہ لے رہی تھی ایک بڑا سا بھونرا میرے رخسار سے چھو گیا خوف کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی لمحہ بھر میں وہی بھونرا دوبارہ میرے چہرے کے قریب تھا میں نے زوردار چیخ ماری اور وہیں صحن پر بیٹھ گئی میں پسینے میں شرابور تھی خوف کی شدت نے دیوانہ کر دیا تھا میں نے اپنے لگائے پودے سب کے سب اکھاڑ پھینکے اپنا چمن اجاڑ دیا، نہ پھول ہوں گے نہ بھونرے آئیں گے اسی دوران میرے شوہر میرے پاس آ چکے تھے اور میرے دیوانے پن کو حیرت سے دیکھ رہے تھے میری حالت ان کے سامنے تھی کچھ کہہ نہ سکے خاموشی سے چمن کو اجڑتا دیکھتے رہے، میں جب چمن کو مکمل برباد کر چکی تب ہوش آیا اور میں بے اختیار رونے لگی، پھولوں کے ڈھیر یاد آنے لگے پھولوں سے بھرا دامن یاد آیا وہ پُربہار راستے یاد آئے جو مہکتے باغوں کی طرف لے جاتے تھے اور پھر یہ ویرانیاں پُربہار یادوں پہ چھا گئیں۔۔۔۔

بدلتے موسموں کے ساتھ دن رات کا سفر جاری رہا میرے بہت سے بچے تھے سب بڑے ہو گئے سب کی رنگت گلابی تھی لیکن ایک کا رنگ کم تھا میرے شوہر اسے اپنے گلشن کا بھونرا کہتے تھے اور مجھے بھی یہ نام اچھا لگنے لگا تھا،

میں ذہنی طور پر بھونروں سے مانوس ہونے لگی مجھے خواہش ہوئی کہ پھر چمن بنایا جائے جہاں تتلیاں رقص کرنے لگیں جہاں پھر سے بھونرے گنگناتے ہوئے میرے پاس ہو کر گزریں اور میں مسکرا دوں ———!

میرے سب بچے تعلیم و روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر جا چکے ہیں لیکن
یہ "بھونرا" بیٹا اب بھی میرے ساتھ رہتا ہے وہ مجھے کہیں چھوڑ کر نہیں جاتا
چاہتا اور میں اس کے لئے ایک باغیچہ لگانا چاہتی ہوں مگر مجھ میں اب باغبانی کا
حوصلہ نہیں "ہاتھوں میں لکیروں کا وزن اتنا ہے کہ میں کدال جیسی چیزیں نہیں سنبھال
سکتی میرا "بھونرا بیٹا" باغبانی کر رہا ہے اور کچھ ہریالی سی اس ویرانے میں نظر آنے
لگی ہے میں پھر کھڑکی سے "نظارۂ بہار" کر رہی ہوں اب یہی تو کر سکتی
ہوں نا ؟ ———

اور پھر.......

بادشاہوں کو شکار کھیلنے کا شوق تو ہوتا ہی ہے محفوظ قلعوں کی دیواریں ان کو روک نہیں سکتیں ۔

اس وقت بادشاہ کا برق رفتار گھوڑا اپنے آقا کو پیٹھ پر بٹھائے اڑا جا رہا تھا، شکار کی تلاش میں آج بادشاہ اکیلا ہی نکل گیا تھا۔ بہت دور تک چلنے کے بعد بادشاہ کو پیاس محسوس ہوئی تاحد نظر جنگل نظر آ رہا تھا، گھوڑا رک گیا، بادشاہ ابھی سوچ میں تھا کہ چھم چھم کی آواز پر چونک پڑا، یہ چھم چھم ہر سمت سے سنائی دے رہی تھی کچھ دیر بعد، کہیں درختوں کے پیچھے سے ایک خواب "مجسم" بن کر نکل آیا ــــــــ ننھے پر بندی سجائے، چوڑیوں سے کلائیاں بھری ہوئیں، چہرے پر آدھا گھونگھٹ، چُنری کا گوٹہ لگا دوپٹہ اور اسی طرح کا گھاگرا، پاؤں میں چھم چھماتی پائل، جگمگاتی جوتیاں اور یہ "چہکا چوند شبیہ" بادشاہ کی آنکھوں کو خیرہ کر گئیں اس شبیہ کے ہاتھ میں چاندی کا پوجا والا تھال تھا جس سے چندن اور بیلے کی خوشبو پھیل رہی تھی، چھوٹا سا دیپ بھی روشن تھا شاید اس "شبیہ" نے کوئی منت مانی تھی اس تھال میں کچھ لڈو چاندی کے ورق سے سجے رکھے تھے۔ بادشاہ گھوڑے سے اتر آیا

اور اس "روشن شبیہ" سے کہا "بہت پیاس لگی ہے! شبیہ نے گھونگھٹ کی
کی اوٹ سے چہرہ اوپر کر کے اس نوجوان بادشاہ کو سوالیہ انداز میں دیکھا کہ کہیں
یہ اس کے خوابوں کا شہزادہ تو نہیں؟ دونوں نے لمحہ بھر ایک دوسرے کو دیکھا
وھی ھے' وھی ھے'........ دو آوازیں ایک ہوگئیں' بادشاہ
نے پوچھا' تم اس جنگل میں کیا کر رہی ہو؟ دیوتا .... کا انتظار
.... نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں' جنگل میں ساز گو نجنے لگے' ہوائیں
نغمے سنانے لگیں .... خشک ڈالیوں سے کلیوں کے چٹکنے کی صدا آنے
لگی بادشاہ ہونٹوں پہ پیاس اور آنکھوں میں سرشاری لئے لوٹ گیا ....
پھر دیوتا نے اس یجان بھاگمتی کے نام پر اس جنگل میں "بھاگیہ نگر"
کے نام سے شہر بسا ڈالا اور پھر .... اور پھر بھاگ متی کے بھاگ جاگ
اٹھے' بادشاہ نے بھاگ متی سے شادی کر کے " حیدر محل" کا خطاب
دیا اور پھر .... اور پھر .... بھاگیہ نگر کا نام رکھا "حیدرآباد"

"چراغ"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعور جاگتے ہی تصیب سو جاتا ہے۔ ہزاروں تمنائیں خزاں رسیدہ درختوں کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہیں، کبھی بہاروں کا موسم نہیں ہوتا اس کے باوجود کچھ امیدوں کے پھول کھلے رہتے ہیں اکثر و بیشتر ان حالات کا سامنا رہتا ہے۔

کبھی ہم صبر پی جاتے ہیں کبھی بے قراریاں ہم کو پی جاتی ہیں، دہشتِ دل اور سکونِ دل کے درمیان ہم تنہا کھڑے کسی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ انتظارِ حیات سے بھی زیادہ طویل ہوتا ہے، کبھی یہ سانسوں کی طرح مختصر بھی ہو جاتا ہے۔

کاروانِ حیات رہنما کے بغیر چلتا ہے لیکن ہمسفر کی تلاش ہر راہرو کو ہوتی ہے کسی نہ کسی کو کسی کی تلاش ضرور ہوتی ہے دو چار قدم ہی سہی، کوئی ہمقدم تو ملے، چراغ بجھ جائیں تو ضروری نہیں کہ صبح قریب ہی ہو، شب کے درمیان بھی چراغ جلتے ہوئے اچانک بجھ جاتے ہیں "میں بھی عجیب طرح کے ماحول میں آگئی ہوں، جہاں نہ اندھیرا محسوس ہوتا ہے نہ اجالے نظر آتے ہیں، ہمسفر کی بات ہی کیا، کاروانِ حیات ہی گُم ہے میں صبر پی کر بھی بے قراری کے لبوں پر جم گئی ہوں"

انجم کے ہاتھ میں قلم بہت تیزی سے چل رہا تھا اس کا ناول ابھی تک مکمل نہ ہو سکا تھا حالاں کہ ناول لکھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر اب کی بار نہ جانے کیوں اس

ناول میں دیر ہو رہی تھی، اس کی گرتی ہوئی صحت نے اُسے آخری ناول لکھنے پر اکسایا تھا اس ناول کا نام اس نے "چراغ" رکھا تھا۔ اس ناول کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ہر کردار مرکزی کردار لگتا تھا۔ بظاہر یہ کردار ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے مگر ہر کردار اپنے اندر انفرادیت رکھتا تھا، یہ کہانی گھریلو ماحول میں پرورش پاتے ہوئے اچانک باہر کی فضا میں شطرنج کی بساط کی طرح بچھ جاتی ہے جہاں ہر مہرہ اہم ہے، ہر ایک کو جنگ کرنی ہے ہر کوئی فاتح بننے کی فکر میں ہے ہر کوئی "شہ کو مات" دینا چاہتا ہے، ایک فتح کی خواہش بے شمار مہروں کو شکست دیتی جاتی ہے۔

انجم، دورِ حاضر کی نامور ناول نگار ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہی تھی یہی آخری "چراغ" تو اس نے ہمیشہ آندھیوں سے بچا رکھا تھا اس چراغ کی کہانی اس کے فن کی ہی مظہر نہیں بلکہ اس کی زندگی کی تکمیل تھی۔ "وسعتِ کائنات" میں کھوئے ہوئے ماں، باپ کی تلاش میں اس نے ساری عمر شادی کے بغیر گذار دی تھی ایک ٹرین کے حادثے میں انجم بچ گئی اور ماں باپ کی لاش تک نہ مل سکی ایک رحم دل انسان نے اس کی پرورش کی مگر دس سال کی انجم کو یقین تھا کہ اس کے ماں باپ مرے نہیں بلکہ کہیں گم ہو گئے ہیں جو اسے ضرور ملیں گے اور وہ اتنی بڑی ہو کر بھی اپنے محسن انسان کی بات ہرگز نہیں مانتی تھی اس کا ایمان تھا کہ وہ شادی امی یا باکی پسند سے ہی کرے گی اسے یاد تھا کہ بچپن میں اس کی منگنی سہیل سے ہو چکی تھی لاشعور میں سہیل موجود تھا اس لیے اس کا کہنا تھا کہ میرے ماں باپ کا مجھ پر پہلا اختیار ہے، محسن انسان کا نام ایاز تھا انھوں نے بڑے پیار سے انجم کو پالا تھا ان کی بیگم بھی انجم کو اولاد ہی کی طرح چاہتی تھیں انجم کو تعلیم بھی دلوائی، ہر طرح آرام بھی دیا پھر انجم نے ضد کر کے ایک جونیئر کالج میں بحیثیت لکچرر ملازمت

بھی کرلی یہ فطری طور پہ ناول نگار تھی اس کے کئی ناول چھپ چکے تھے کئی بار ایوارڈ
مل چکے تھے مگر نہ ملے تو اس کے ماں باپ ہی نہ ملے کئی اچھے رشتے بھی اس کے آئے
مگر اس نے ہر بار انکار کردیا'

عمر بڑھتی ہے تو سعت گرنے لگتی ہے انجم تنفس کا شکار تھی اس نے ناول لکھنے میں
حتی الامکان تیزی دکھائی' بالآخر ناول چھپ گیا "چراغ" سے دنیائے ادب میں
روشنی بڑھ گئی اس کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کی بچپن کی تصویر بھی اس میں چھپی تھی مکمل
تعارف کے ساتھ.......

امی! امی! یہ دیکھئے بابی کی تصویر' رخشاں نے ناول کے سرورق پر چھپی
انجم کی تصویر ماں کو دکھائی جس کی کاپی [illegible] کے پاس بھی تھی' امی فرطِ مسرت سے رو پڑیں
رخشاں' انجم کی چھوٹی بہن تھی جو اس حادثاتی سفر میں ان کے ساتھ نہیں تھی وہ چھوٹی تھی
اس لئے اسے پھوپی کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا ماں باپ دونوں کے سر پر گہری چوٹ آئی
تھی اور وہ کئی روز ہاسپٹل میں بے ہوش رہے تھے اس دوران انجم کا بیگ جس میں اس کے
کپڑے اور تصویر تھی انجم کو مل گیا اس طرح یہ خاندان بچھڑ گیا' برسوں بعد ناول کی اشاعت
نے اس خاندان کا پتہ دیا' بابا کے سر کی چوٹ شدید تھی وہ دماغی دواخانے میں تیس سال
سے شریک تھے وہ کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے' زندگی کتنی اجنبی ہو جاتی ہے اگر حافظہ نہ ہو تو
......کہ ہم اپنے آپ کو بھی پہچان نہیں پاتے' دوسرے دن صبح امی اور رخشاں کو لئے
مدراس کی ٹرین حیدرآباد کی طرف روانہ ہوچکی تھی رخشاں کے شوہر بھی ساتھ تھے۔ منزل مقصود
پر پہنچ کر دروازے پر لگے بٹن کو رخشاں نے اتنی زور سے بجایا کہ کال بیل کی آواز پر انجم
کا دل بری طرح دھڑک اٹھا' ایاز صاحب نے دروازہ کھولا تو سامنے یہ چھوٹا سا قافلہ

انجم کو پوچھ رہا تھا انجم نے دیکھا تو ماں سے لپٹ گئی "تیئس برس" معمولی عرصہ نہیں ہوتا" ساری کہانی اشکوں کی زبان جاری تھی حال کے بھنور میں پھنس کر بھی انسان ماضی کا کنارا نہیں بھول پاتا" ———

انجم نے جو چراغ جلایا تھا وہ اس کی زندگی کو روشن کر گیا یہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو برسوں کی جدائی کے بعد راستے کے اس موڑ پر مل جاتے ہیں جہاں منزل سامنے ہوتی ہے کبھی کی ملاقاتیں جدائی کا غم دیتی ہیں، کبھی جدائی کی گھڑیاں ملن کی پیامبر ہو جاتی ہیں"

بیٹی! یہ رخشاں کا شوہر ہے سہیل ----!

ماں نے کہا آواز تو سنائی دی مگر نظر کچھ نہ آسکا انجم کا تنفس بڑھ گیا — سانسوں کی رفتار تیز بہت تیز ہو گئی اور جلتے ہوئے "چراغ" کی لو کھڑنے لگی —!—!

"تابانیاں"

برسوں سے سینے میں دبی شوقِ ادب کی چنگاری اچانک شعلہ بن کر بھڑک اٹھی، فرزانہ آفرین کی پاؤں میں بندھی زنجیریں گھنگرو کی طرح بجنے لگیں، شہر کی مشہور ادبی انجمن کی ممبر شپ کے بعد فرزانہ خود کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگی، بہترین خوشگوار ماحول، قابل و مخلص ہستیوں کے ساتھ اس کا وقت گذرنے لگا، ویسے اس کے گھر میں کیا نہیں تھا؟ وہ سب کچھ، جس کے خواب دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنے لوگ جاگے بغیر ہی سوتے رہ جاتے ہیں، ماضی کا کوئی کانٹا دل میں شاید چبھا رہ گیا ہو لیکن بظاہر اس کی زندگی قابلِ رشک تھی کہیں کوئی خلا نہ تھا، کہیں خاردار جھاڑیوں کا سلسلہ بھی نظر نہیں آتا تھا، کہیں بھی حسرتوں کے کارواں نہیں تھے۔ کہیں بھی مایوسی کی دھول اڑتی منظر نہیں آتی تھی، مگر ــــــــ

فرزانہ کو بہر حال کچھ "کم کم" سا محسوس ہوتا تھا، خوشنما، مثالی گھر کے در و دیوار اجنبی لگتے تھے، یہاں پر سجی ہوئی ہر شئے اسے محرومی کا احساس دلاتی تھی، سارے رشتے غیروں جیسے محسوس ہوتے، اس کے باوجود اپنے رویّے سے اس نے گھر والوں کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنی ذات کو تنہا محسوس کرتی ہے اور سارے جہاں کی اداسی اپنے اندر سمیٹ کر ٹھاٹ سے زندگی گذارتی رہی۔ ــــــ

کبھی کبھی کوئی موتیوں کی مالا اگر ٹوٹ جائے تو ایک موتی دھاگے سے الگ نہیں ہوتا بلکہ بہت سارے موتی اِدھر، اُدھر بکھر جاتے ہیں ــــــ!

اسی طرح فرزانہ کی چھوٹی موٹی آرزوئیں بھی گھر کے سخت ماحول میں بکھر گئی تھیں، وقت

نے اپنی کمان سے "تیر" کی طرح فرزانہ کو اندھیرے میں چلا دیا، خوبیٔ قسمت سے وہ ایک ستارے سے جا ٹکرائی ..... شاید مقدّر کا ستارا تھا ورنہ کہاں وہ اندھیرے، کہاں یہ اجالوں کا ٹکراؤ ....

فرزانہ آفریں کو اپنی ادبی تربیت کے لئے ایک بہترین رہنما بھی مل گیا افروز صاحب ... کی شب و روز محنتیں رنگ لانے لگیں، ہر رسالے میں فرزانہ آفریں کے افسانے چھپے اور پسند کئے جاتے رہے۔

فرزانہ آفریں کا قلم روانی سے چلنے لگا۔ ایک ہی نشست میں کئی افسانوں کی تخلیق ہو جاتی جسے افروز صاحب محفوظ کر لیتے صبح و شام گذرتے رہے "بے لگام گھوڑا" دوڑتا رہا افروز صاحب کی الماری بھرنے لگی ..... !

ایک دن افروز صاحب کتابت شدہ کچھ افسانے فرزانہ کو دکھلانے کے لئے لے آئے مہروانجم صرف آسمان پر ہی نہیں کبھی چہروں پر بھی دمک اٹھتے ہیں فرزانہ کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی، افروز صاحب نے فرزانہ کا خوشیوں سے معمور چہرہ دیکھا اور خود بھی بے انتہا خوشی محسوس کرنے لگے ویسے بھی افروز صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو خوشی کو امانت سمجھ کر محفوظ رکھتے ہیں اور پھر حقدار کو لوٹا دیتے ہیں، وہ فرزانہ کے افسانوں کا مجموعہ چھپوانے کی خوشخبری دے کر چلے گئے ....

فرزانہ پھر لکھنے بیٹھ گئی "خونِ دل" کے عنوان سے ایک اور افسانہ شروع کیا، اپنی داستانِ حیات قلم کی نذر کرتے ہوئے کئی صفحات لکھ ڈالے ایک جنون سا طاری تھا، حالات کے مارے لوگ بظاہر بڑے طاقت ور نظر آتے ہیں لیکن اندر سے بالکل کھوکھلے ہو جاتے ہیں فرزانہ کا بھی یہی حال تھا لکھتے لکھتے یادوں کا بوجھ بڑھنے لگا ماضی کی تلخ چنگاریاں خون میں شامل ہونے لگیں ..... اچانک خون کی ایک بوند

کاغذ پر ٹپک پڑی اور پھر بوندوں کا سلسلہ بڑھتے لگا، فرزانہ کی ناک سے خون ٹپک رہا تھا۔ فرزانہ نے ناک پر دستی رکھ لی اور خون کی پروانہ کرتے ہوئے افسانے کی تکمیل میں لگ گئی اس کا "قلمی گھوڑا" اڑنے لگا تھا۔۔۔۔

فرزانہ کا سر گھوم رہا تھا لیکن کوئی غیر مرئی طاقت اس کا قلم چلا رہی تھی اسے اپنے کانوں سے لاوا اُبلتا محسوس ہوا، ہاتھ لگا کر دیکھا تو کانوں سے بھی خون بہہ رہا تھا، خیالوں کے بے شمار ناگ، آفرین کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے فرزانہ آفریں کی تحریریں پتھر کی لکیروں کی طرح کاغذ پر جمی جا رہی تھیں اسے صرف اتنا یاد تھا کہ افروز صاحب "عیسیٰ دوراں" بن کر دنیا میں دوبارہ آچکے ہیں اس سے پہلے کہ قیامت کی گھڑی آجائے وہ "صاحبِ کتاب" ہونا چاہتی تھی افسانہ خون آلود ہونے لگا تھا۔۔۔۔ اور پھر اسی میز پر فرزانہ کا سر ڈھلک گیا۔۔۔۔

دوسری صبح کا تازہ اخبار افروز صاحب کے ہاتھ میں مشہور افسانہ نگار فرزانہ آفریں کی دماغی شریانیں پھٹ جانے سے انتقال" کی خبر دے رہا تھا۔۔۔۔

افسانوں کا مجموعہ "خونِ دل" کی تکمیل ہو چکی تھی ناشر خود افروز صاحب تھے مجموعہ ہاتھوں، ہاتھ بکنے لگا، پھر دوسرا ایڈیشن۔۔۔۔۔۔ پھر تیسرا ایڈیشن شائع کر کے کافی رقم جمع ہوئی، افروز صاحب نے "آفریں لائبریری" قائم کی جہاں پہ نایاب کتابیں پڑھنے اور ریسرچ کرنے کے لئے شہر کی قابل ترین ہستیاں جمع ہوتی رہیں گی، افروز صاحب "یومِ آفریں" بڑے اہتمام سے مناتے ہیں اور اب بھی "خونِ دل" کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔

آفریں نہیں ہے مگر اس کا مستقبل "تابانیوں" کے ساتھ جلوہ گر ہے، حال کے اُجلے پیرہن میں۔۔۔!!